میاں افتخار الدین



شورش کاشمیری

میاںؔ اِفتخار الدّین

{ایک مطالعہ، ایک تجزیہ}

شورشؔ کاشمیری



ناشر ـــــــــــ مطبوعاتِ چٹان لمیٹڈ - لاہور
طابع ـــــــــــ چٹان پرنٹنگ پریس. لاہور
قیمت ـــــــــــ ایک روپیہ پچاس پیسے
باراوّل ـــــــــــ ایک ہزار

فروری ۱۹۶۷ء

مجھے اِس دَور کے بعض چھوٹے بڑے راہنماؤں سے ہم صحبتی و ہم سخنی کے مواقع ملے ہیں۔ دماغ میں ان کے متعلق جو تاثرات ہیں بارہا چاہا کہ لکھوں لیکن فرصت ہی عنقا رہی۔ "چٹان" کی مشغولیتیں اتنی بڑھی ہوئی ہیں کہ کئی ایک زیرِ قلم کتابیں برسوں سے ادھوری پڑی ہیں۔

گذشتہ سال چھ ستمبر کو حکومت نے مجھے ڈیفنس آف پاکستان رولز کی دفعہ ۳۲ کے تحت چھ ماہ کے لئے منٹگمری (اب ساہیوال) جیل میں نظر بند کر دیا۔ ایکا ایکی طبیعت قرطاس و قلم کی طرف مڑ گئی۔ یہ کتابچہ جو آپ کے مطالعہ میں ہے دو چار روز میں تیار ہو گیا۔

میاں صاحب کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ برسوں سے میرے ذہن میں تھا۔ یہ تصویر فوراً ہی تیار نہیں ہوئی بلکہ ایک مسلسل مطالعہ کی تلخیص ہے۔ ضروری نہیں کہ اس تجزیئے اور مطالعے سے خوانندگانِ محترم کو بھی اتفاق ہو۔ ہر انسان کے احساسات تجربے و مشاہدے کی بنا پر مختلف ہوتے ہیں۔ میں نے میاں صاحب کے متعلق جو محسوس کیا وہ بلا کم و کاست لکھ دیا ہے۔ یہ ان کی سوانح عمری نہیں اور نہ ان کے افکار و اعمال کا بہ تمام و کمال تجزیہ ہے یہ ان کی سیرت کا ایک عکس ہے جو کچھ لکھا ہے وہ بڑے ماپ تول کے بعد لکھا ہے، ان کا تجزیہ ہی نہیں کیا خود

اپنا ذہن بھی سامنے رکھ دیا ہے جس سے یہ تجزیہ اور واضح ہوگیا ہے۔

سیاستدانوں کے افکار و اعمال پر قلم اٹھانا بڑا مشکل ہے اور یہ مشکل اس وقت اور بھی پیچیدہ ہو جاتی ہے جب طرفین میں فکر و نظر کا اختلاف ہو۔ یعنی جس شخص پر لکھا جا رہا ہے اور جو شخص لکھ رہا ہے ان دونوں میں ذہنی فاصلہ ہو۔ میاں صاحب اور راقم میں کچھ ایسا ہی فاصلہ تھا۔ لیکن جہاں تک اس تجزیے اور مطالعے کا تعلق ہے اس "سوانحی حکایت" میں کسی لحاظ سے بھی کوئی پیچ و خم نہیں ہے۔ جو شخص قلم کی آبرو کا خواہاں ہو وہ کسی تصویر کو بھی اس کے رنگوں اور خطوں سے علیحدہ نہیں کر سکتا ہے۔

میں نے میاں صاحب کی تجزیاتی تصویر ان کے سیاسی آئینے میں دیکھی اور اپنے ادبی چوکھٹے میں جڑی ہے۔ اس امر کا فیصلہ قارئین ہی کر سکتے ہیں کہ اسی تصویر کا ہو بہو عکس ہے یا قلم میں کہیں جھول آگیا ہے۔

شورش کاشمیری

۳ فروری ۱۹۶۷ء

لاہور

انتساب

میاں صاحب کا جنازہ باغبانپورہ کے بازاروں سے گزر رہا تھا. لیکن بازار بدستور کھلے تھے. اِدھر اُدھر خوردہ فروشوں کا غل تھا. دکانوں پر گاہکوں کی بھیڑ تھی معلوم ہوتا تھا ایک اجنبی اپنے آبائی راستوں سے جا رہا ہے. یا پھر ان لوگوں کو خبر نہیں ہوئی ہے کہ شالامار کا ایک سرو ٹوٹ گیا ہے. ملک کی ایک سیاسی آبرو رحلت کر گئی ہے. اس خراب آباد سے وہ شخص اُٹھ گیا تھا جس کا وجود باغبانپورہ کی دستار میں طُرۂ افتخار تھا جس کی بدولت پاکستان اور ہندوستان کے بڑے بڑے راہنما یہاں کھنچے چلے آتے تھے.

ایک عجیب تأثر تھا جو باغبانپورہ کے اس چلن سے میرے دل پر نقش ہو گیا۔

انتساب کے لئے عموماً معروف ہستیوں کی تلاش ہوتی ہے. لیکن میں یہ اوراق باغبانپورہ کی اس سرد مہری کے نام معنون کرتا ہوں. جس کا مشاہدہ میاں صاحب کے جنازے پر ہوا تھا. ع

اِک جنازہ جا رہا تھا دوش پر تقدیر کے

شورش کاشمیری



کتابیں

تنہائی کی دوست ہیں

میاںؒ
اِفتخار
الدّین،

زمانہ بڑے غور سے سن رہا تھا
ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے

شورشؔ
کاشمیری

طابع و ناشر
مطبوعات چٹان لمیٹڈ
۸۸ میکلوڈ روڈ
لاہور
مغربی پاکستان

۱۹۳۷ء میں ہندوستان کو جب پہلی دفعہ صوبائی خود مختاری ملی تو میاں افتخارالدین واحد مسلمان تھے جو لاہور کے دیہاتی حلقہ سے کانگریس کے ٹکٹ پر کامیاب ہوئے تھے۔ لیکن یہ ٹکٹ ہی تھا ان کی کامیابی کا اصل سبب ان کا روپیہ ان کی زمینیں ان کے مزارعے اور شہید گنج کی تحریک کا ہلکا پھلکا اثر تھا۔

میں نے انہیں پہلے پہل ڈاکٹر شیخ محمد عالم کے ہاں دیکھا ڈاکٹر صاحب خالص شہید گنج کے ٹکٹ پر کامیاب ہو کر فوراً ہی کانگریسی ہو گئے۔ میاں افتخارالدین اس دوسرے کانگریسی مسلمان ممبر کو ملنے کے لئے ان کے ہاں تشریف لائے تھے۔ ان کا بنگلہ اُن دنوں جین مندر پرانی انارکلی سے ذرا آگے مزنگ روڈ اور لیک روڈ کے نکڑ پر واقع تھا۔

میری عمر بھی اُن دنوں کچھ زیادہ نہ تھی۔ شہید گنج کی تحریک نے سیاسیات میں لا پھینکا تھا۔ یا تو میاں صاحب کی باتیں اتنی عالمانہ تھیں کہ میری عمر سے آگے تھیں۔ یا وہ باتیں ہی کچھ ایسی کر رہے تھے کہ طبیعت ہی اُدھر نہیں آتی تھی۔ البتہ ان کے چہرے مہرے میں خاصی دلکشی تھی، تھے تو وہ منحنی سے لیکن چمک دار سیاہ آنکھوں پر چشمہ عجب بہار دے رہا تھا۔ گاندھی ٹوپی چوڑی دار پاجامہ، کھڈی کا ریشمی کرتہ، کشمیرے کی اچکن پاؤں میں تسمہ دار بوٹ باتوں میں رکھاؤ تو نہیں تھا، لیکن اٹکاؤ ضرور تھا۔ ڈاکٹر صاحب ان کے مقابلے میں پرانے گھاگ تھے۔ میاں صاحب کی دولت اور ڈاکٹر صاحب کی ذہانت میں معانقہ ہوتے ہوتے رہ گیا۔ نہ ڈاکٹر صاحب انہیں جذب کر سکے نہ میاں صاحب ان میں جذب ہو سکے، دونوں ایک ہی پہاڑی سے نکلی ہوئی دو مختلف ندیاں تھیں، جن کا کسی مقام پر سنگم ہونا مشکل تھا۔ ڈاکٹر صاحب برساتی نالے کی طرح جوش میں آجاتے تھے۔ ان میں ایک دریا بن جانے کی پوری خصوصیتیں موجود تھیں۔ لیکن انہوں نے عمر بھر اتنی گذر گاہیں بدلیں کہ اپنا وجود ہی ختم کر لیا۔ بالآخر سیاسی ریگ زار ہو کر رہ گئے۔ میاں افتخار الدین آبجو بھی نہ تھے لیکن ایک نخلستان ضرور تھے۔ اس نخلستان کے پانی دیوا شالیمار کے باغبان تھے یہ نخلستان پروان چڑھا تو بہت سوں نے اس کا پھل کھایا۔ آخر ایک خاص قبیلہ مستفید ہوتا رہا۔ اس کی چھاؤں میں زیادہ دیر وہ لوگ بیٹھتے رہے جو اشتمالی

سانچوں میں ڈھلے ہوتے تھے۔ لیکن نجی زندگی میں غزل کے مختلف المعانی مصرعے تھے میاں صاحب دِنوں ہی میں شہرت کے بام رفیع پر پہنچ گئے۔ وہ ان تمام لوگوں کو پیچھے چھوڑ گئے جنہوں نے اپنی زندگیاں کانگریس کے لیے وقف کر رکھی تھیں۔ جو قید و بند کی صعوبتوں کا بار اُٹھاتے رہے۔ شب و روز اس کیلئے ہمہ تن مشغول رہے، گھر بار لٹایا، اپنا کچھ نہ بنایا، اولاد کا مستقبل تباہ کیا۔ پھر وہ لوگ ذہانت و قابلیت میں بھی پیچھے نہ تھے۔ لیکن انہیں وقتی طور پر زندہ باد کے نعرے ملے، جو ہوا کی موجوں میں گھُل مل کر ختم ہو گئے۔ میاں صاحب نے بالی عمریا ہی میں ان سب کو پیچھے چھوڑا اور فراٹے بھرتے ہوئے آگے نکل گئے۔

میاں صاحب کے آگے نکلنے کے وجوہ بھی تھے۔ مثلاً کانگریس میں مسلمانوں کا قحط تھا اور پنجاب کا معاملہ خاص طور پر دگرگوں تھا۔ مولانا عبدالقادر قصوری سامنے آتے ہوئے ہچکچاتے تھے۔ خود پنجاب کے کانگریسی لیڈروں کو بھی ان کی شخصیت سے بُعد تھا۔ ڈاکٹر سیف الدین کچلو کے پالیٹکس میں اکالی گھاس پھوس کے علاوہ اَنا تھی۔ کانگریس ہائی کمانڈ اپنی آن کا مجسمہ تھا۔ احرار ۱۹۳۱ء میں کانگریس سے الگ ہو کر عملاً کانگریس کے مدمقابل ہو گئے تھے۔ ڈاکٹر شیخ محمد عالم دوبارہ "صنم خانہ" میں آئے تھے لیکن کانگریس کے "برہمنوں" کو ان پر بھروسہ نہ تھا۔ ان کے علاوہ اور کوئی مسلمان کانگریسی قابل ذکر نہ تھا۔ میاں افتخار الدین کی "تشریف آوری" کانگریس کے لیے طاقت کا باعث تو نہیں لیکن مسرت کا باعث ہو گئی۔ مولانا ابوالکلام آزاد

نے گود میں کھلایا۔ جواہر لال نے جھولے میں جھلایا مہاتما گاندھی نے نگہداشت کی۔ میاں افتخار الدین ایکا ایکی کانگریس کے صوبائی نیتا ہو گئے۔ دولت ان کے ہاں وافر تھی۔ یار لوگوں کو دستر خوان پر جمع کرتے کیا دیر لگتی ہے؟ ڈھیروں کارکن جمع ہو گئے لیڈروں کا تانتا بندھ گیا۔ مولانا ابوالکلام آ رہے ہیں۔ جواہر لال پہنچ رہے ہیں۔ باغبانپورہ میں اُن کا جدّی مکان یا قلعہ ہندوستان کے بڑے بڑے قومی لیڈروں کا مرکز ہو گیا۔

مہمان خانے کھلے ہوتے ہیں، دستر خوان بچھے ہوتے ہیں، مہمان آ رہے ہیں مہمان جا رہے ہیں۔ بظاہر اس پر نکتہ چینی بھی کی جا سکتی ہے۔ اُس زمانے میں بھی مختلف البحر زبانیں کھُلی تھیں لیکن پنجابی جاگیرداروں کی الراعی جماعت سے میاں صاحب کا نکلنا بلاشبہ ایک "معجزہ" تھا ان کے پاس اتنی دولت تھی کہ وہ آسانی سے دوسرے جاگیرداروں کا "مثنیٰ" ثابت ہو سکتے تھے۔ وہ ایک ریاست نما اراضی کے مالک تھے۔ اُن کے لیے نوابی ٹھاٹھ سے رہنا مشکل نہ تھا۔ لیکن انہوں نے "شاہد و شراب" کی زندگی بسر کرنے کے بجائے "فکر و انقلاب" کا راستہ اختیار کیا۔ اُس وقت اُن کے خواب و خیال میں بھی نہ ہو گا کہ اس سفر کے نفع و نقصان کی مقدار کیا ہے؟ لیکن انہوں نے طاؤس و رباب پر روپیہ صرف نہیں کیا۔ بلکہ شطرنج کے اس کھیل پر روپیہ لگایا جس میں بسا اوقات پیادہ سے فرزیں شہ مات کھا جاتا ہے۔

میاں صاحب کو اپنے سوانح حیات لکھوانے کا بہت شوق تھا، لیکن

انہیں کوئی الطاف حسین حالی ملا، نہ سید سلیمان ندوی، گاندھی وہ تھے نہیں کہ انہیں پیارے لال نصیب ہوتا، یا راجن بابو کی طرح ان کے افکار و سوانح پر کوئی قلم اٹھاتا ترقی پسندوں کے ایک خاص گروہ کو انہوں نے "پاکستان ٹائمز" اور "امروز" کی معرفت ستارۂ اُفق بنا دیا لیکن ان میں سے کسی بھی جانشین کو توفیق نہ ہوئی کہ وہ اپنے "نپولین" کی زندگی لکھتا۔ خود میاں صاحب میں حوصلہ نہ تھا یا شاید وہ اپنی زندگی کو اس مقام و مرتبہ پر نہ سمجھتے تھے کہ آپ بیتی لکھتے - وہ زبان و قلم دونوں کے دھنی نہ تھے البتہ دماغ اُن کا حاضر رہتا۔ دل غالباً اُن کے پاس تھا ہی نہیں، اور اگر تھا تو اپنی علیل صحت کے پیش نظر علیحدہ کر رکھا تھا۔ زبان ان کے پاس ایک نہیں کئی تھیں۔ راون کے دس سر بیان کئے جاتے ہیں۔ اُن کی دس زبانیں تھیں ہر طرز کی بولی میں اُتارو تھے۔ انہیں اپنی دولت پر اتنا گھمنڈ تھا کہ سرکش گھوڑے کی طرح پیٹھ پر ہاتھ دھرنے نہیں دیتے تھے۔ وہ "نظام زر" کے "سخت مخالف" اور اعتقاداً کمیونسٹ تھے۔ لیکن خود ایک بڑے سرمایہ دار ہونے کے علاوہ بڑے جاگیردار بھی تھے۔ اُن کی زمینوں میں بھی مزارع تھے اور اُن مزارعوں سے مختلف نہیں تھے جن کا تذکرہ زار کی زرعی معیشت کے تحت آتا اور کسانوں کو انقلاب کی دعوت دی جاتی ہے جمال پور جلال پور ان کی "ریاست" کا نام تھا لیکن وہاں کے مزارعین بھی عام مزارعوں ہی کی طرح تھے۔ میاں جمال الدین، میاں صاحب کے والد ماجد تھے۔ اپنی وسیع اراضی کو انہوں نے اور بھی وسیع کیا تھا۔ ان میں یہ خوبی تھی کہ

زمانۂ گزشتہ کے مسلمان زمینداروں کی طرح متشرع اور لب ولہجہ کے لحاظ سے انتہائی خلیق تھے۔ جب کوئی آس پاس کا چھوٹا موٹا زمیندار مرجاتا اور اس کی نابالغ اولاد رہ جاتی یا اسی قسم کے حادثے وقوع میں آتے تو وہ اولاد کی دستگیری کرتے، انہیں قرض دیتے جب وہ قرض ادا نہ کر سکتے تو رفتہ رفتہ زمین کے مالک ہو جاتے۔ اس طرح جمال پور جلال پور کا موضع بن گیا۔

میاں افتخار الدین نے عمر بھر اپنے گاؤں میں پرائمری اسکول نہ بننے دیا، بلکہ بعض روایتوں کے مطابق ڈسٹرکٹ بورڈ کی خواہش کے باوجود پرائمری اسکول قائم نہ ہوا۔

وہ شد ومد سے دولت کی تقسیم کے "پرچارک" تھے لیکن خود کبھی ایک کوڑی بھی تقسیم نہ کی، اس حیرت انگیز تضاد پر جب کوئی انہیں ٹوکتا تو وہ دوشیزہ کی کہہ مکرنی ہو جاتے، اپنے مخالفوں کے خلاف پراپیگنڈا کرنے میں انہیں کمال حاصل تھا بلکہ غیب میں دوسرے کے ٹانکے بھی ادھیڑتے۔ لیکن کوئی الزام اپنے سر پر نہیں آنے دیتے تھے۔ وہ کھُل کے وار کرنے کے عادی نہ تھے، کارکنوں کو ہاتھ میں رکھتے اور ہر شخص کو جو ان کے نزدیک ہوتا، درجہ بدرجہ استعمال کرتے، ان کی معیشت اور ان کی سیاست کے دوست یا اہلکار ایک دوسرے سے مختلف تھے، جس شخص کو بزعم خویش مزاحم پاتے بشرطیکہ وہ اقتدار میں نہ ہو، اور معاشی طور پر کمزور ہو اُس پر کھُلم کھُلا حملہ کرتے، اور اُس کو زک پہنچانے کے لیے ہر حربہ استعمال کرتے اس

سلسلہ میں وہ صحیح العقیدہ کمیونسٹ تھے کہ دشمن کے خلاف ہر قسم کا ہتھیار اٹھانا جائز ہے۔ جس شخص کو ناپسند کرتے اور اندیشہ ہوتا کہ فلاں شخص ان کی سرپرستی کے بغیر اُبھر رہا ہے، یا انہیں خاطر میں نہیں لاتا، یا اُس کی شخصیت اپنے طور پر بھی نشوونما پا رہی ہے، یا وہ ان سے باہر اپنا الگ وجود رکھتا ہے اُس کو سیاسی زہر دینے کی دُھن میں لگ جاتے، انہوں نے اس غرض سے اپنے اخباروں کو بڑی بے جگری سے استعمال کیا۔ کئی لوگ ان کا شکار ہوتے ہر وہ جماعت جس سے مذہب کی بو آتی اُس کو رسوا کرنا ان کا شعار تھا۔ احرار کو انہوں نے مسلم لیگ کے انداز میں دشنام سے تو نہیں لیکن الزام سے ذبح کیا، مرحوم پنجاب میں پاکستان بن جانے کے بعد بلکہ تحریک پاکستان کے دنوں ہی میں اُن کا سب سے بڑا کارنامہ یہ رہا کہ انہوں نے احرار سے اپنا سیاسی قرض پورے طور پر چکایا۔ انہیں احرار سے ہمیشہ کدر رہی، جس سے اُن کے تحت الشعور میں مخاصمت پیدا ہو گئی۔

ان کے دماغ میں کئی خانے تھے وہ ان خانوں کو بکمال و تمام حرکت میں رکھتے مثلاً دماغی طور پر اُن کے کمیونسٹ ہونے کا ذکر پہلے ہو چکا ہے، ورنہ عملاً وہ سفاک طبیعت کے بورژوا تھے، تہذیباً وہ امریکی روایتوں کے جمہوری تھے، تعلیماً اُن کا دماغ برطانوی سانچہ میں ڈھلا ہوا تھا، کانگریس میں تھے تو انہیں مذہب سے تنفر تھا کہ چودھری افضل حق کا جنازہ نہ پڑھا، بلکہ ہندو لیڈروں کے ساتھ الگ کھڑے رہے۔ سیاستہً بائیں بازو میں تھے۔ لیکن بائیں بازو میں بھی سوشلسٹوں

کے حریف اور کمیونسٹوں کے حلیف تھے۔ مسلم لیگ کا زور بندھا تو گاندھی کیپ کو کونے کھدرے میں پھینک جناح کیپ اوڑھ لی اور "پکے مسلمان" ہو گئے۔ پاکستان کا مطلب کیا ہے؟ لا الہ الا اللہ۔ لیکن آپس میں بیٹھتے تو لینن کے حوالوں سے پاکستان کو ہندوستان کی مسلمان اقوام کا حق خود ارادیت کہتے۔ وقت پڑنے پر پکے الراعی ہو جاتے۔ کیونکہ اس طرح انہیں اپنی برادری کے روایتی تعصبات سے فائدہ اُٹھانے کا پورا پورا موقع ملتا۔ احرار کے صدر مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی بھی الراعی تھے۔ اسی واسطہ سے میاں صاحب نے انہیں گانٹھا اور وہ انہی کے ہاں ٹھہرنے لگے، لیکن یہ جادو جلد ہی اُتر گیا۔ میاں صاحب مولانا حبیب الرحمٰن کے ذہن ہی سے نکل گئے۔

جس زمانہ میں میاں صاحب صوبہ کانگریس کے صدر تھے احرار کا پنجاب میں طوطی بول رہا تھا، مسلم لیگ ابھی سامنے نہیں آئی تھی اور نہ اُس نے پاکستان کے موقف ہی کو اختیار کیا تھا۔ میاں صاحب احرار سے قدم ملا کر چلنا چاہتے تھے۔ ایک روز مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی دفتر احرار میں انہیں چودھری افضل حق کے پاس لائے۔ فرمایا کہ میاں صاحب احرار میں شریک ہونا چاہتے ہیں

چودھری صاحب اُس وقت طرح دے گئے، وہ چلے گئے تو مولانا سے کہا احرار کو غریبوں ہی کی جماعت رہنے دیجئے، ان بوریہ نشینوں کے ساتھ میاں صاحب کی گذر ناممکن ہے۔ میاں صاحب سیاسی بھونرا ہیں۔ احرار میں افلاس ہے تو اخلاص

بھی ہے۔ سرمایہ دار غریبوں کی جماعت میں قدم رکھے تو وہ جماعت احساس کمتری کا شکار ہو جاتی ہے۔ اُمرا، غربا میں کھڑے ہوں تو بیٹھنے کی جگہ خود بڑھ کر اُن کے قدم چوم لیتی ہے۔ اور جب بیٹھنے کی جگہ مل جائے تو صدارت عقیدت کے طور پر نذر کر دیتے ہیں۔ پھر جب صدارت پر کسی امیر کا تصرف ہو جائے تو غربا میں طبعی ردعمل کے طور پر انتشار شروع ہو جاتا ہے۔

چودھری صاحب کے نزدیک انتشار اور افتخار ہم قافیہ الفاظ تھے۔ میاں صاحب نے چودھری صاحب کے اس اِنکار کو گرہ میں باندھ لیا۔ اور عمر بھر احرار کو معاف نہ کیا۔ جب تک احرار کا ڈنکا بجتا رہا وہ ان کے خلاف شوشے چھوڑتے رہے۔ حتیٰ کہ مولانا ابو الکلام آزاد کو بھی احرار سے بدظن کر دیا۔ اور ان کی بدظنی کا تاثر بعض افراد کے معاملہ میں آخر وقت تک رہا۔ جب احرار کو شہید گنج کھا گئی تو احرار کی نعش خونچکاں پر استہزا کے قہقہے چھوڑنے والوں میں میاں صاحب پیش پیش رہے۔ پاکستان بن جانے کے بعد احرار کے معاملہ میں اُن کا رویہ دوستانہ گھاؤ اور دشمنانہ ترحم کا ملا جلا حملہ تر کانہ تھا کہ اس شبخون کی الفاظ میں شرح ہی نہیں ہو سکتی ہے انہوں نے جہاں تک بن پڑا احرار سے ذہنی انتقام لیا۔ برصغیر کی طرح احرار بھی دو ملکوں میں بٹ گئے۔ چودھری افضل حق کا قبل از پاکستان انتقال ہو گیا۔ مولوی مظہر علی اظہر احرار سے نکل گئے۔ مولانا حبیب الرحمٰن پاکستان آ کر پاکستان سے چلے گئے، پاکستان میں اب صرف وہی لوگ رہ رہے تھے جو پاکستان میں پہلے سے

مقیم تھے یا پھر مہاجروں میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری، ماسٹر تاج الدین انصاری اور شیخ حسام الدین وغیرہ اُٹھ کر آتے تھے۔ شاہ جی تو سیاسیات سے توبہ تلا کر بیٹھے۔ انہوں نے کہا، انگریز چلا گیا ہمارا مشن ختم ہو گیا۔ فرماتے میری جدوجہد اب حسینی نہیں حسنی ہو گئی ہے۔ ماسٹر جی احرار کے صدر ہو گئے، لیکن احرار اس وقت آثار قدیمہ تھے۔ شیخ صاحب صرف شیخ صاحب تھے، ان لوگوں کی طبیعت تھک چکی تھی۔ اور اب سیاسیات میں شکست کھا کر حقیقتاً اس کے قابل ہی نہ رہے تھے۔ میاں افتخار الدین نے ان کی مذہبی حس کو بھی گوارا نہ کیا۔ چنانچہ قادیانی نبوت کے تعاقب میں احرار کے بڑے بڑے اجتماعات سے وہ خوش ہونے کے بجائے آزردہ ہوتے۔ انہیں گویا ملال ہوتا کہ لوگ اب بھی احرار کی تقریریں سننے کے لیے جمع ہوتے ہیں۔ امروز و پاکستان ٹائمز کے دروازے انہوں نے احرار زعماء کے ماضی و حال کی سرگزشت کے لیے بند کر رکھے تھے۔ کبھی کبھار عام خبروں کے ساتھ ان کا بھی ذکر آجاتا۔ جس زمانہ میں احرار نے ختم نبوت کی تحریک میں راست اقدام کیا۔ لاہور مارشل لاء کی زد میں آگیا۔ نوجوانوں کی ایک بڑی جماعت کو گولیوں سے بھونا گیا۔ میاں صاحب لاہور میں تھے ان کے ایڈیٹر حکومت کو مشورہ دیتے رہے کہ اس تحریک کو سختی سے دبائے۔ ان کے رفقاء کافی ہاؤس میں بیٹھ کر شہداء پر مردار ہونے کی پھبتی کستے، وہی مخصوص الزام، امریکی استعمار کی شعبدہ بازی، پھر ایک دن خبر آئی کہ میاں صاحب اچانک کراچی روانہ ہو گئے ہیں وہاں

پارلیمنٹ میں انہوں نے حسب عادت شور وغل کیا۔ یہ تضاد ان کے ہاں عام تھا۔ دوسرے تیسرے روز معلوم ہوا کہ میاں صاحب پھر سے لندن جا چکے ہیں۔ اس زمانہ میں انہوں نے بہت سا عرصہ لندن ہی میں گذارا۔ جب سے پاکستان بنا، یورپ امریکہ، روس چین غرض ساری دنیا ان کے لیے ایسے تھی جیسے وہ پاکستان کے مختلف شہروں میں اُڑے پھرتے ہیں۔ اس دفعہ وہ لندن میں بیمار بھی ہو گئے۔ انہیں دل کا دورہ پڑا۔ تشویشناک خبریں آتی رہیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے کرم کیا اور وہ صحت یاب ہو گئے۔ اس زمانہ میں انہوں نے چینی کوئلہ کی باربرداری اور روس کے اعانتی و رعایتی نیوز پرنٹ کی تجارت سے ملک میں لاکھوں روپے اور ملک سے باہر لاکھوں پونڈ پیدا کئے۔ چین کی ایک ہی شرط تھی کہ کوئلہ کی باربرداری میاں صاحب کی معرفت ہو سکتی ہے۔ نیوز پرنٹ SUBSIDIZED تھا ایک صاحب جو مرکزی حکومت میں ایک بڑے عہدہ پر تھے اپنی سبکدوشی کے عرصہ بعد پروگریسو پیپرز لمیٹڈ کے منیجنگ ڈائریکٹر بھی ہو گئے۔ ملازمت کے دوران عجیب و غریب حکایتیں بیان کرتے تھے۔ مثلاً اُن کا بیان تھا کہ پروگریسو پیپرز لمیٹڈ باقاعدہ ایل سی کھولتی ہے۔ روپیہ بھی منتقل ہوتا ہے۔ لیکن یہی روپیہ لندن میں میاں صاحب کو کمیونسٹ پارٹی پر خرچ کرنے کے لیے سٹرلنگ کی شکل میں دے دیا جاتا ہے۔ میاں صاحب کو بھی اپنے بارے میں یہ الزام معلوم تھا، لیکن وہ ہنس کر ٹال جاتے کیونکہ اسی قسم کی افسانہ سازیاں وہ اپنے مخالفوں کے متعلق کیا

کرتے تھے۔

کمیونسٹوں کی عالمگیر عادت ہے کہ جب وہ کسی جماعت سے ناراض ہوتے ہیں تو اُسے سامراجیوں کا ایجنٹ کہتے ہیں کسی فرد سے بگڑتے ہیں تو اس پر خفیہ پولیس کے گماشتہ ہونے کا الزام دھرتے ہیں۔ کسی معرکہ میں ہار ہوتی ہے تو رجعت پسندوں کی سازش قرار دیتے ہیں۔ کسی تحریک میں جیتتے ہیں تو عوام کی فتح گردانتے ہیں میاں صاحب ان سیاسی ہتھکنڈوں کے استعمال میں پختہ مشق تھے۔ عامۃ الناس میں ان کی باتوں کا اس لیے بھی چرچا ہو جاتا کہ ایک تو ان کے گماشتوں کی زبانیں کترنی کی طرح چلتی تھی، دوسرے وہ خود بھی ہوا دینے میں ید طولیٰ رکھتے تھے، تیسرے اُن کے پاس ملک کے کثیر الاشاعت اخبارات تھے۔

میاں صاحب کی انہی اُڑان گھاتیوں سے تنگ آکر خان لیاقت علیخاں نے انھیں مسلم لیگ سے نکال دیا۔ سردار شوکت حیات کو ساتھ ملا کر میاں صاحب نے آزاد پاکستان پارٹی کی بنیاد رکھی۔ شوکت اکل کھرے انسان تھے۔ میاں صاحب کے ساتھ دیر تک لگے رہے۔ تا بہ کُے آخر دو ایک سال کی رفاقت سے دل برداشتہ ہو کر الگ ہو گئے۔ نامور لوگوں میں میاں محمود علی قصوری واحد انسان ہیں جو آخر وقت تک ان کے ساتھ رہے۔ آجکل مغربی پاکستان میں آزاد پاکستان پارٹی کی جانشین نیشنل عوامی پارٹی کے کسٹوڈین جنرل بھی وہی ہیں۔ ان کے سوا ایک بھی نامور شخص ایسا نہیں جو اُن کے ساتھ رہا ہو، یا جس نے ساتھ دینا چاہا ہو اور مدت

تک رہ سکا ہو۔ وہ بڑے شکی مزاج، بداعتماد اور سوءِ ظن کے عادی تھے۔ انہیں اپنے سوا کسی پر بھروسہ نہیں تھا۔ میرا خیال ہے کہ وہ اپنی ذات پر بھی شاذ ہی بھروسہ کرتے تھے۔ انسانوں کے معاملہ میں وہ انتہائی متلون مزاج تھے انہیں احساس ہی نہیں تھا کہ ایک شخص کے بارے میں ابھی کچھ دیر پہلے ساتھیوں میں بیٹھے کیا الاپ رہے تھے۔ اور اب اُس شخص سے دسترخوان پر "بصیغہ راز" کانا پھوسی کر رہے ہیں۔ وہ قول و فعل کے تضاد سے شرماتے نہیں تھے۔ یہ بات اُن کے دماغ پر نقش ہو چکی تھی کہ دولت ساتھیوں کو مہر بلب کرتی اور علیبوں کو ڈھانپ دیتی ہے۔ اپنی شخصیت کو بلند رکھنے اور بالا کرتے کا انہیں بہت شوق تھا۔ ہمیشہ راتوں رات ہیرو بن جانے کے خواہاں رہے۔ میدان کھلا تھا۔ لاہور میں کانگریس نے دفعہ ۱۴۴ توڑنے کے لیے احتجاجی جلوس نکالا کئی راہنما پیش پیش تھے۔ موری دروازہ کے باہر پولیس سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ چھوٹو رام کا ایک رشتہ دار رام سنگھ اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ پولیس تھا۔ اُس نے مظاہرین کے روڑہ پھینکنے پر میاں صاحب کے منہ پر طمانچہ مار دیا — لوگوں کو غصہ آگیا۔ نتیجۃً خشت باری تیز ہو گئی۔ دونوں طرف دیر تک رسہ کشی ہوتی رہی۔ اس مظاہرہ کی بدولت میاں صاحب کا ملک بھر میں چرچا ہو گیا۔ اسمبلی میں سوال کئے گئے صدر کانگریس نے پنجاب کے وزیر اعظم کو لکھا۔ غرض چاروں طرف میاں صاحب ہی میاں صاحب ہو گئے۔

گاندھی جی کی تحریک (۱۹۴۲ء) کے دنوں میں انہوں نے بحیثیت صوبائی صدر، کوشش کی کہ ان کی گرفتاری دھوم دھڑکے سے ہو، اس وقت صحیح طور پر یاد نہیں آرہا کہ انہی دنوں کا واقعہ ہے یا انفرادی ستیہ گرہ کے زمانے کا۔ بہرحال وہ اپنی گرفتاری پر عوام کی نمائش چاہتے تھے۔ اس خواہش کو لے کر وہ مولانا مظہر علی اظہر کے پاس دفتر احرار میں گئے۔ اور ان سے کہا کہ وہ گرفتاری کے وقت عوام کا زبردست مظاہرہ چاہتے ہیں۔ گولی چل جاتے تو بھی ہرج نہیں۔ اس سے صوبہ میں زندگی کی لہر دوڑ جائے گی۔ مولانا مظہر علی ان کا مطلب پا گئے۔ انہوں نے میاں صاحب سے کہا کہ اپنی گرفتاری کی نمائش کے لیے بے گناہ عوام پر گولی چلوانا، اور اس کو تحریک کے زور باندھنے کا حربہ خیال کرنا احمقانہ خیال ہے۔ میں اس بے ڈھنگی نمائش کا مشورہ نہیں دے سکتا۔ آپ مرضی کے مالک ہیں۔

کانگریس سے اڑ کر میاں صاحب لیگ میں پہنچ گئے۔ تو سیٹھ سدرشن اور دیوان چمن لال نے نواب ممدوٹ سے کہا کہ ہم نے آپ کو ایک نادرۂ روزگار تحفہ دیا ہے۔ آپ اس کی حفاظت کیجیے گا۔ جلد ہی آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ آپ کے پاس کیا چیز آگئی ہے۔ لیکن میاں صاحب نے پنجاب میں مسلم لیگ کو مسلم لیگ بنا دیا۔ صوبائی لیگ کے راہنما اُن کے اس احسان کا بدلہ نہیں چکا سکتے کہ خضر وزارت کی بندشوں کے پرخچے اڑا کر انہوں نے مسلم لیگ کے صوبائی زعما کو یک شبی ہیرو بنا دیا۔ اور وہ تمام لوگ جیل میں چلے گئے جن کے متعلق کبھی خواب میں بھی تصور

نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اور تو اور، ملک فیروز خان نون کے ٹی کے، سی ایس آئی، کے سی آئی ای، کے سی ایم جی بھی اپنی یہودی نژاد اہلیہ کے ساتھ قید ہو گئے۔ ثقہ دوستوں کا بیان ہے کہ بعض ایم بی ای اور او بی ای قسم کے شہزادے جیل خانہ میں جو بلاشبہ ان کے لیے ایک تفریح گھر تھا، میاں صاحب کو دونوں ہاتھوں سے کوستے اور آپس میں چہ مے گوئیاں کرتے تھے۔ کہ کانگریس کے اس ایجنٹ نے مسلم لیگ کو بھی جیل خانہ کی راہ دکھادی ہے۔ میاں صاحب کے اس اقدام سے پنجاب مسلم لیگ نہ صرف نامور ہو گئی، بلکہ خضر وزارت کو بھی بعجلت مستعفی ہونا پڑا۔ یہ میاں صاحب کی جرآت ہی کا نتیجہ ہے کہ آج مسلم لیگ کی تاریخ میں قید کے ان چند دنوں کا ذکر بڑے فخر و ناز سے کیا جاتا ہے۔

میاں صاحب فی نفسہٖ کوئی عبقری انسان نہ تھے، پڑھے لکھے ضرور تھے اور تاریخ کا علم بھی تھا۔ لیکن ماں باپ کا اکلوتا بچہ ہونے کی وجہ سے ان کی عادتیں متوازن نہ تھیں۔ مثلاً ان میں ہر مقام اور ہر مجلس میں نمایاں رہنے کا جذبہ بڑا تیز تھا۔ ان کی شخصیت کے پیش نظر حسد کا لفظ مناسب نہ ہوگا۔ لیکن بہرحال وہ حاسد بھی تھے۔ وہ مقرروں کی تقاریر کو عوامی مقبولیت کی ترازو میں تولتے، تالیاں گنتے زندہ باد کے نعروں کی پیمائش کرتے۔ کوشش کرتے کہ سب سے آخر میں بولیں تاکہ لوگ انہیں حاصل کلام سمجھیں۔ اگر اُن کی تقریر میں داد و تحسین کے آوازے کم ہوتے تو اگلے روز وہ اپنے کارکنوں کو ٹوکتے اور پوچھتے کہ زندہ باد کے نعرے لگانے میں

کمی کیوں ہوئی، داد و تحسین کا غلغلہ کمزور کیوں رہا؟ لطف کی بات یہ ہے کہ ان میں ایک اچھے مقرر کی خصوصیتیں بالکل ہی نہ تھیں۔ وہ مقرر ضرور تھے لیکن دوسرے درجے کے۔ ان میں خطابت کے ترکیبی اجزاء کا تناسب سرے سے تھا ہی نہیں۔ قدرت نے خطابت کے صفات سے انہیں محروم رکھا تھا۔ لیکن ایک خاص نہج کے پارلیمانی سپیکر ضرور تھے۔ پارلیمنٹ میں وہ پوری تیاری سے جاتے اور یہ تیاری ان کے سیکرٹری یا دوسرے دوست کرا دیتے۔ بولنے کا انداز وہاں بھی پُر تاثیر نہیں تھا، پُر معلومات ضرور تھا۔ پاکستان ٹائمز اور امروز چونکہ ان کے اپنے اخبار تھے اس لیے وہ ان کی تقاریر کو سجا بنا کر بڑے کروفر سے شائع کرتے گویا وہ اپنے دور کے سسرو، ڈیماستھنیز، اینڈ منڈ برک اور ڈیزرالی ہیں۔ پروگریسو پیپرز کے اخباروں کی اس روش کے خلاف ایک دفعہ نیشنل اسمبلی میں احتجاج بھی ہوا

یہ اُس زمانہ کا ذکر ہے، جب مسٹر محمد علی بوگرہ وزیر اعظم تھے۔ مری میں قومی اسمبلی کا اجلاس ہو رہا تھا۔ مشرقی پاکستان کے ذہین و فطین ارکان کی باغ و بہار تقریروں نے سماں باندھ رکھا تھا لیکن شہ سرخیوں کے ساتھ اخباروں میں میاں صاحب ہی نمایاں و ممتاز نظر آتے۔ اس پر سابق مرکزی وزیر مسٹر فضل الرحمٰن نے بھرے اجلاس میں کہا تھا، پاکستان ٹائمز گویا عوام الناس کو یہ تاثر دے رہا ہے کہ قومی اسمبلی میں صرف میاں افتخار الدین واحد مقرر ہیں جو کام کی باتیں کرتے یا پھر بلبل کی طرح چہکتے ہیں۔

میاں صاحب میں ایک اور عادت تھی کہ وہ عموماً دوسروں کی تقریر نہیں سنتے تھے اپنی تقریر کی اور چلے گئے چنانچہ ان کی اس دلچسپ عادت کا بھی اسمبلی میں ذکر ہوتا رہا۔

بہت کم لوگوں کے علم میں ہوگا کہ میاں صاحب ایک زمانہ میں باریش و بروت نوجوان تھے یہ اُن کے سفرِ زندگی کا آغاز تھا۔ میاں صاحب پڑھ پڑھا کر انگلستان سے لوٹے۔ تو لاہور میں کسی طرح بریلوی فرقہ کے سرخیل مولوی دیدار علی شاہ رام پوری کے ہتھے چڑھ گئے۔ مولوی صاحب لاہور میں بریلوی جماعت کے امیر اور مولوی احمد رضا خاں کے نائب تھے۔ ان میں کئی "خوبیاں" تھیں۔ مثلاً انہوں نے لاہور میں بدعات کی تخم پاشی کی۔ مذہب کو میلادی محفلوں سے آسان کیا۔ سرکار دوستی کا جواز نکالا۔ علمائے دیوبند کیلئے سب و شتم کی نیو رکھی۔ میاں صاحب ان کے مریدوں میں شامل ہوگئے تو انہی کے ہو گئے۔ انہوں نے میاں صاحب کی دولت سے میلاد کی زکوٰۃ نکالنی شروع کی۔ آئے دن میلاد کی محفلیں ہوتیں، میاں صاحب خود راوی تھے کہ جس زمانہ میں نہرو رپورٹ کی مخالفت کا غل اٹھا، اور مولانا ظفر علی خاں، سید عطاءاللہ شاہ اور چودھری افضل حق وغیرہ اس پر دستخط کر کے لکھنو سے لاہور پہنچے تو سرکار نے ان کی مخالفت کا الاؤ دہکا رکھا تھا۔ انگریز ڈپٹی کمشنر اور دوسرے اہلکاروں کو نہرو رپورٹ کے نتائج و اثرات سے اتنی دلچسپی تھی کہ پنجاب برطانیہ

دشمنی سے محفوظ رہے۔ کیونکہ یہاں حکومت کو بہادر اور سستا سپاہی مل جاتا تھا
مولوی دیدار علی سرکار پرست تو تھے ہی، تحریک خلافت میں بھی الگ رہے
تھے۔ ان کے مرشد و پیشوا نے تو علانیہ مخالفت کی تھی۔ یہ موقع ان کے انتقام کا تھا۔
سرکار و دیدار میں گٹھ جوڑ ہو گیا۔ مولانا ظفر علیخاں اور سید عطاء اللہ شاہ بخاری پر
دہلی دروازہ کے باہر جلسہ عام میں زبردست پتھراؤ کیا گیا۔ مولوی دیدار علی اور ان کے
لگے بندھوں نے عامۃ المسلمین کو مشتعل کر رکھا تھا۔ تھوڑے دنوں بعد مولوی
صاحب نے مولانا ظفر علیخاں کے خلاف کفر کا فتویٰ صادر کر دیا۔ ان کے اس فتویٰ
کی زد میں اور اکابر بھی آ گئے۔ علامہ اقبال کے خلاف بھی شکوہ کی بنیاد پر ان مولوی
صاحب ہی نے کفر کا فتویٰ دیا تھا۔ پھر اسی فتوی پر بس نہیں کی، دوسرا فتویٰ
جاری کیا کہ زمیندار پڑھنا حرام ہے۔ جو شخص زمیندار پڑھے گا، اس کی بیوی کا
نکاح فسخ ہو جائے گا۔ ایک روز خود مولوی دیدار علی صاحب زمیندار پڑھتے
ہوئے پکڑے گئے۔ مریدوں نے استعجاب کیا تو شرعی حیلہ پیدا کر کے انہیں چپ
کرا دیا۔

میاں صاحب نے راقم الحروف سے بیان کیا کہ دہلی دروازے کے باہر
شاہ جی، مولانا اور چودھری صاحب پر پتھر پھینکنے والوں میں وہ پیش پیش تھے بلکہ
یہ پتھر بھی انہوں نے جمع کئے تھے۔ اور پتھراؤ کرنے والے نوجوانوں کا انتظام
بھی ان کے ہاتھ میں تھا۔

میاں صاحب فرماتے تھے کہ "ایامِ جاہلیت" کے ان واقعات نے ان کی طبیعت کو منغض کر دیا اور وہ ردِ عمل کے طور پر مذہب کے اس طائفہ سے الگ ہو گئے یہ مارکسزم کے متعلق اُن کے مطالعہ کا آغاز تھا۔ مارکسزم انہوں نے کہاں تک پڑھا؛ کچھ کہنا مشکل ہے۔ کیونکہ ان کی گفتگو سے کبھی کسی علمیت کا اظہار نہیں ہوا۔ عموماً سماعی باتوں پر انحصار رکھتے لیکن جہاں تک اُن کی ذاتی لائبریری کا تعلق ہے۔ اس میں ہر قسم کی کتابیں موجود تھیں۔ بعض کتابوں کے تو ورق بھی نہیں کھُلے تھے۔ اس ضمن میں ایک خاص خوبی کے مالک تھے۔ جس ذہن کے دوست گھر میں مدعو کرتے اور جس کمرے میں نشست لگاتے وہاں خاص قسم کی کتابوں کا ایک شیلف لگوا دیتے۔ مثلاً ایک دفعہ مجھے اور راجہ حسن اختر کو یاد فرمایا جس کمرے میں سوتے تھے اسی میں کرسیاں بچھا دی گئیں۔ طاق پر نظر پڑی تو ایک خوشنما شیلف میں علامہ اقبال کی کتابوں کا سیٹ نہایت مرصع جلدوں میں پڑا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ انہیں علامہ اقبال اور ان کی فکر سے دُور کا بھی تعلق نہ تھا۔ ہمارے ایک کروڑ پتی دوست نے ایک دفعہ کہا تھا آپ ہر روز کیا غالب غالب کرتے ہیں وہ زندگی بھر بھوکا رہا، چند سو روپے بھی نہ کما سکا۔ میاں صاحب کی زبان سے بھی ایک دفعہ اسی قسم کا فقرہ نکل گیا، کہنے لگے اقبال مذہبی مُلا تھا۔ اُس نے انگریزی پڑھ لکھ کر گنوا دی۔ اس کا فلسفہ چرندوں پرندوں کا فلسفہ ہے۔ وہ ماضی کی دعوت دیتا رہا۔ حالانکہ ماضی کبھی لوٹ کر نہیں آتا۔ اس کے کلام میں مار دھاڑ

یا تسلیم و رضا ہے۔ جس سے انسان میں جدوجہد کا قومی شعور ہی مفقود رہتا ہے اضطراراً اُن کے مُنہ سے نکل گیا۔ وہ سوچ ہی کیا سکتا تھا جب کہ اُس کو تمام عمر پیٹ بھر کے روٹی نہیں ملی۔ پھر انہیں معاً خیال آیا کہ وہ ایک اقبالی سے گفتگو کر رہے ہیں۔ اپنے کھوکھلے قہقہوں کے ساتھ موضوع بدل گئے۔

لیکن مذہب سے اُن کا تنفر کتابوں کی بنا پر نہیں عماموں کی بنا پر تھا۔ کیونکہ شروع میں انہیں ایک ایسے مذہبی گروہ سے واسطہ پڑا جو مذہب کا دوکاندار تھا۔

اقبال کے ضمن میں ایک اور بات یاد آگئی جس سے میاں صاحب کی عجیب و غریب سیرت پر روشنی پڑتی ہے۔ ہم لوگ کسی مشترکہ جلسہ سے فارغ ہوتے تو میاں صاحب مجھے اور راجہ حسن اختر کو کھینچ کھانچ کے اپنے ساتھ لے گئے۔ اُنہیں معلوم تھا کہ راجہ صاحب اقبال کے پرستار ہیں۔ موٹر گھما کر علامہ اقبال کی قبر پر چلے گئے وہاں ان کے مزار سے اظہار عقیدت کرتے رہے۔ رات ایک پہر بیت چکی اور مرقد پر روشنی گل ہو گئی تھی۔ اپنے موٹر کی بتیاں جلا دیں، بیرونی عمارت کو دیکھتے رہے پھر ہم دونوں کو ایک گوشہ میں لے کر بیٹھ گئے۔ یوم اقبال کا ذکر کرتے رہے۔ تھوڑی دیر بعد موضوع پر آ گئے کہنے لگے ہم لوگ آپس میں مل کر کام کریں تو اپوزیشن کا مقدر جلد چمک سکتا ہے۔ یہ لیاقت علیخاں کا زمانہ تھا۔ کام کرنے کا ایک عام نقشہ بھی تیار کیا۔ اس وقت اُن کا غالب ذہن یہ تھا کہ لیاقت علی خاں پنجاب سے زیادتی کر رہے ہیں۔ اس کا سدِ باب ہونا چاہیئے۔ بات حمید نظامی پر آ رُکی کہ

اُنہیں بھی شریک گفتگو کریں۔

اگلے روز میاں صاحب کا انتظار رہا کہ ابھی تشریف لاتے ہیں، لیکن میاں صاحب کہاں؟ حال یہ تھا کہ گھر میں ہو کر بھی نہیں ہوتے تھے۔ ان کا سیکرٹری ٹرخا دیتا تھا۔ اور یہ سب کچھ اُن کی ہدایات کے مطابق ہوتا تھا۔

اس سے اگلے روز مجھے گورنر کے پرائیویٹ سیکرٹری کا فون آیا کہ نشتر صاحب یاد فرماتے ہیں ابھی آجاؤ۔ میں جا حاضر ہوا۔ نشتر صاحب میرے معاملہ میں انتہائی مخلص تھے۔ کہنے لگے۔ میاں صاحب کل آئے تھے۔ علامہ اقبال کے مزار پر آپ لوگوں نے لیاقت علیخاں کے خلاف جو حلف اٹھایا ہے اُس کی پوری رُوداد سنا گئے ہیں۔ فیض تو اندر ہو گیا ہے، اب تمہارا ارادہ بھی کچھ ایسا ہی ہے؟

میں پہلے تو متعجب ہوا۔ پھر میں نے اپنے ذہن پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

فیض تو فوجی سازش میں اندر ہوئے ہیں ہم تو اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے

نشتر صاحب مسکرائے فرمایا

"سیاسی سازش،، بھی تو خطرناک ہو سکتی ہے۔ جس سازش میں افتخار الدین ہوں وہ خطرناک نہیں ہوتی، تاہم احتیاط ضروری ہے"

میں نے آج تک میاں صاحب کے معاملہ میں حسن ظن نہیں رکھا تھا۔ اس چیز نے میری بدظنی میں اور بھی اضافہ کر دیا۔ میں نے چاہا میاں صاحب کہیں مل جائیں ہفتوں تلاش کیا لیکن میاں صاحب کا پتہ ہی نہ چلا کہاں ہیں۔ گھر میں فون کرو تو جواب ملتا دفتر میں ہیں۔ دفتر فون کرو

تو معلوم ہوتا گھر میں ہیں۔ ایک روز سراغ ملا کہ میاں صاحب کراچی گئے ہوئے ہیں۔ وہاں سے خبر آئی کل رات لندن چلے گئے ہیں کب آئیں گے؟ کچھ معلوم نہیں!

اس قسم کے شوشے چھوڑنے یا تیر چلانے میں میاں صاحب کو کمال حاصل تھا چاہتے یہی تھے کہ باغباں اور صیاد دونوں راضی رہیں، لیکن باغباں اور صیاد میں سے کسی کو بھی راضی نہ رکھ سکے۔ غالب کا مشہور مصرع۔ ؏

یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے

اُن کے قدوقامت پر بعض رعائتیوں کی نسبت سے چوکس بیٹھتا تھا۔

یہ صحیح ہے کہ انہوں نے اپوزیشن کے نام پر دو زبردست اخبار نکالے اور مارشل لا کے حبالۂ عقد میں آنے سے پہلے ان اخباروں کا کردار حزب اختلاف ہی کا رہا۔ اور یہ وہ کارنامہ ہے کہ میاں صاحب کی اس عظیم خدمت کو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن ان اخبارات کا اختلافی تصور بھی ایک خاص قسم کی سیاسی فکر میں ڈھلا ہوا تھا۔ ان میں صرف اُن خیالوں اور شخصیتوں ہی کو جگہ ملتی تھی۔ جنہیں میاں صاحب اور ان کے رفیقوں کی خوشنودیٔ مزاج اور اعانت فکر حاصل ہو۔ ایک خاص مرحلہ میں یہ اخبار افراط و تفریط کا مرقع ہو گئے۔ نتیجتہً حکومت کی رجعتی طاقتوں کو پریس کی آزادی کے خلاف سخت ڈپٹ کرنے کا موقع ملا۔ لیکن نوائے وقت کے نظریاتی ذہن اور روایتی سنجیدگی سے قطع نظر ان اخباروں کا معیار بھی بلند ہی رہا۔ باقی اخبارات جو لاہور سے کراچی تک نکلتے تھے اخبار کم تھے کاروبار زیادہ، اُن کے

مالکوں کو اشتہارات کے حصول اور اشاعت کی رفتار سے دلچسپی تھی۔ وہ قوم وملک کو ثانوی حیثیت دیتے۔ ان کے نزدیک اخبار فروشی اور تمباکو فروشی میں صرف پیشہ کا فرق تھا۔

پاکستان ٹائمز اور امروز کے عملہ ادارت میں چونکہ ذہین لوگ شامل تھے اس لیے انہوں نے اپنے افکار و افراد کو بالا بلند کرنے کے لیے خاص قسم کی پالیسی وضع کر لی تھی وہ جانتے تھے کہ جن لوگوں کی حکومت ہے۔ یعنی جو لوگ اختیارات کی مسندوں پر فائز ہیں وہ ذاتی پبلسٹی کے خواہاں ہیں۔ انہیں چونکہ سیاسی حادثے نے ملک وقوم کے ارباب بست وکشاد میں شامل کر دیا ہے۔ لہٰذا اخبارات کے ذریعے نامور ہونا چاہتے ہیں۔ پاکستان ٹائمز اور امروز نے ان کی تصویریں اور تقریریں چھاپ چھاپ کر انہیں یکسو رکھا۔ اُن کے نزدیک اخباروں کے ثقہ ہونے کا یہی معیار تھا۔ حکمران مطمئن رہتے کہ صفحہ اول پر ان کی تقریر و تصویر آگئی ہے۔ لیکن اخباروں کے بین السطور میں جو کچھ ہوتا وہ میاں صاحب کے واضح خیالات یا عملہ تحریر کے معلوم نظریات تھے جن پر کوئی سا پردہ نہیں پڑا ہوا تھا۔

میاں صاحب کو اپنے طبقہ کا کماحقہ احساس تھا وہ کبھی اس سے باہر معاشری رشتے قائم نہیں کرتے تھے۔ حکمرانوں سے انہوں نے ہمیشہ دوستانہ تعلق رکھا۔ لیاقت علیخاں کے زمانے میں وہ زیادہ رچ پچ نہ سکے لیکن اُن کے نیاز بھی حاصل کرتے تھے۔ اس زمانہ میں انہوں نے بعض اعلیٰ افسروں سے دوستانہ

روابط رکھے۔ لیاقت علیخاں اُٹھ گئے تو حکمرانوں سے اُن کا سلسلہ نیاز بڑھنے لگا۔ ملک غلام محمدؒ کی باقاعدہ حاضری بھرتے۔ لُطف یہ ہے کہ ان سے مل کر ان کے بارے میں خبریں بھی گھڑتے اور لطیفے بھی سناتے تھے۔ اسی زمانہ میں نواب مشتاق احمد گرمانی وزیر داخلہ تھے۔ گرمانی صاحب بڑے ہی وضعدار انسان ہیں۔ فہم و ذکا کا دروازہ اُن پر کھلا ہوا ہے۔ انہیں دوستانہ تعلقات کا بھی احترام رہتا ہے اور وہ اپنے دوستوں کے معاملہ میں حاضر و غائب خوش دلی کے خیالات ظاہر کرتے ہیں۔ جہاں تک حکومت میں معاملہ فہمی اور سیاست دانی کا تعلق رہا وہ بڑے کامیاب انسان تھے۔ میاں صاحب ان کے ہاں بالالتزام جاتے۔ ان کی تعریف و ثنا کرتے بلکہ بعض معاملوں میں ان کو راہنمائی پر آمادہ کرتے۔ لیکن اُن سے مل کے آتے تو وہی کتر بیونت فرماتے۔ جو ان کی فطرت کا جزو لاینفک ہو چکی تھی۔ میاں صاحب مجلسی طور پر حکمرانوں کے دوست تھے لیکن سیاسی طور پر ان سے الگ تھلگ، اس میں جانبین کا فائدہ تھا۔ ہمارے حکمرانوں نے ملک کی اپوزیشن کو اپنے ہی طبقے کے ایک فرد کے حوالے کر کے از خود یہ اطمینان حاصل کر رکھا تھا کہ اُن کا معاملہ کسی جگر دار سے نہیں ایک جاگیردار سے ہے۔ میاں صاحب بھی اس چشم پوشی کو باعث اطمینان خیال کرتے۔ واقعہ یہ ہے اور یہ بات نمایاں ہو کر ایک روز سامنے آجائے گی کہ میاں صاحب نے پاکستان میں جس پروگریسو ازم کی نیو رکھی اس نے تاریخ کے عمل کو تاخیر کی طرف موڑ دیا۔ جس سے حزب اختلاف کو فائدہ نہیں پہنچا بلکہ ملک

اسی مقام پر آگیا۔ جہاں اب ہے۔ میاں صاحب نے اپنے سوا اپوزیشن کی ہر آواز کا بھرکس نکالا اور ہر اُس شخصیت کی راہ میں جو اپوزیشن میں راہنما تھی۔ روڑے اٹکائے۔

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی جب پہلی دفعہ جہادِ کشمیر کے مسئلہ پر گرفتار ہوتے تو امروز اور پاکستان ٹائمز نے ان کے خلاف افسانہ طرازی میں پس و پیش نہ کی، بلکہ پیش پیش ہی رہے۔ ختم نبوت کی تحریک میں بھی میاں صاحب کا مافی الضمیر حکومت کی طرف رہا۔ ایک عجیب بات ہے کہ جس زمانہ میں "سول" اخبار مشہور صنعت کار نصیر اے شیخ کو منتقل ہوا اور انہوں نے ایک اردو روزنامہ بھی نکالا، تو امروز اور پاکستان ٹائمز نے نصیر اے شیخ کی "احمدیت" کا ذکر چھیڑ دیا۔ جس سے ان دونوں اخباروں کو مار پڑی، حتیٰ کہ ان کا چراغ گل ہو گیا۔ میاں صاحب کے نزدیک یہ حربہ اس وقت جائز ہو گیا تھا۔

شہید سہروردی کے معاملہ میں بھی میاں صاحب اپنے روایتی کردار پر قائم رہے اور ان کے مقابلہ میں اعیانِ حکومت سے تعلقات قائم رکھے۔ حکومت کی بہ نسبت عوامی لیگ کو ان کی جماعت آزاد پاکستان پارٹی نے زیادہ رسوا کیا۔ خان عبدالغفار خاں جب تک جیل میں رہے میاں صاحب نے مدتوں چپ سادھے رکھی۔ "چٹان" نے سب سے پہلے ان کی رہائی کے مسئلہ کو چھیڑا۔ پھر جب چٹان کی آواز کو پرواز حاصل ہوئی تو میاں صاحب بھی چہچہا اٹھے۔ ظاہر ہے کہ اُن کی آواز میں

وسعت اور طاقت نہ تھی لہذا وہ اس مسئلہ کے سرخیل ہو گئے۔ ورنہ میاں صاحب خان عبدالغفار خاں کے ذاتی طور پر کبھی ارادت مند یا ہمنوا و ہم خیال نہ تھے۔ "نوائے وقت" نے ملک میں اپوزیشن کو بڑی طاقت دی۔ لیکن میاں صاحب حمید نظامی کے قلم سے اپنے بغض کو کبھی چھپا نہ سکے۔ "نوائے وقت" پر اُفتاد آئی تو انہوں نے فی الواقعہ اطمینان محسوس کیا۔ ان کے اخباروں نے عام تعاون سے بھی ہاتھ اٹھا لیا۔ احرار کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ ان کے خلاف تو میاں صاحب شروع ہی سے ذہنی طور پر صف آرا رہے۔ کانگریس میں تھے تو کمین گاہ سے حملہ آور ہوتے کانگریس سے نکلے لیگ میں پہنچے تو کھلم کھلا وار کئے۔ آزاد پاکستان پارٹی بنائی تو انہیں اپنا حریف سمجھا۔ وہ جانتے تھے کہ پنجاب میں احرار کی موجودگی میں اُن کا چراغ روشن نہیں رہ سکتا۔ انہوں نے پنجاب میں احرار کے قتل عمد میں شریک ہو کر جان نثاروں کی ایک ایسی جماعت کو تاراج کیا جس کے برگ و بار سے ملک کے نازک مرحلوں میں جرأتمندانہ فائدہ اُٹھایا جا سکتا تھا۔ سرحد ان کی دسترس سے باہر تھا۔ سندھ میں وہ جا نہیں سکتے تھے یا جانا نہیں چاہتے تھے۔ کراچی کے اہل زبان انہیں کہاں ٹکنے دیتے۔ مشرقی پاکستان میں اُن کے نام اور کام کا چرچا تھا۔ لیکن اس کو وہ اپنی جولاں گاہ بنانے سے قاصر تھے۔ ان کے گرد کمیونسٹ نوجوانوں کی ایک بڑی کھیپ جمع تھی۔ دونوں ایک دوسرے کو اپنے اپنے طور پر استعمال کرتے۔ میاں صاحب کے اس سیاسی چال چلن کا نتیجہ یہ نکلا کہ ملک اپوزیشن کے صحیح مقام سے محروم رہا۔ اور وہ اپوزیشن کے ایک

عظیم راہنما کہلانے کے باوجود اپوزیشن کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ثابت ہوتے یہی وجہ تھی کہ میاں صاحب کے ان چوچلوں اور چہلوں کی بدولت آخر وقت تک ان کا صحیح دوست کوئی نہیں رہا اور جو مٹھی بھر لوگ ان کے شریک خیال تھے وہ بھی ان کے سخت نکتہ چین رہے۔ اُن کے دستر خوان سے اُٹھ کر آتے تو یہ لوگ ان پر تبرا بھی تولتے تھے۔

ہندوستان کی تقسیم کے بعد پاکستان کی کمیونسٹ پارٹی ویران ہوگئی۔ سجاد ظہیر نے پاکستان میں قیام کرنا چاہا لیکن زیادہ دیر رہ نہ سکے۔ آخر ہندوستان چلے گئے اوّل تو کمیونسٹوں میں اس بات کا سراغ لگانا مشکل ہوتا ہے کہ ان میں سرکاری گماشتہ کون ہے اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں ان کا اور چھور کیا ہے۔ دوم یہ آپس میں بھی ایک دوسرے کے دوست نہیں ہوتے۔ سجاد ظہیر پاکستان میں بڑے دنوں انڈر گراؤنڈ رہے۔ اگر انہیں سرکاری افسر سہارا نہ دیتے یا محمد شعیب سابق وزیر خزانہ پاکستان کے مرحوم بھائی نیاز احمد (سی ایس پی) اپنے ہاں ٹھہراتے نہیں تو چاپ شدہ کمیونسٹوں کے ہاتھ سے وہ بہت پہلے پکڑے جاتے۔ لیکن جب پکڑے گئے تو ان کے گرفتار کرانے والوں میں ترقی پسندوں کے اعضاو ارکان ہی تھے۔ تماشا یہ ہے کہ کمیونسٹوں کے رفقار خود مخبری کرتے اور الزام اپنے مخالفوں پر دھرتے ہیں۔

سجاد ظہیر کی رخصتی کے بعد کامریڈ فیروزالدین منصور پارٹی لیڈر ہو گئے۔ وہ

عمر بھر دمہ کے مریض رہے۔ میاں صاحب نے ان کا غالباً ایک سو روپیہ ماہوار وظیفہ لگا رکھا تھا۔ دونو ایک دوسرے کی خوبیوں اور کمزوریوں سے واقف تھے۔ لیکن منصور حد درجہ غریب تھے جہاں تک مارکسزم کا تعلق ہے۔ کافی سمجھدار تھے اس کے لیے قید و بند کے شرائط بھی سہے۔ لیکن جو لوگ ان کے ہم خیال نہیں تھے ان کے معاملہ میں وہ میاں صاحب سے بھی چار قدم آگے تھے جو منہ میں آتا کہہ جاتے۔

منصور صاحب ہر روز کافی ہاؤس میں آتے اور حلقہ باندھ کر بیٹھتے۔ عام دوست انہیں دادا کہتے۔ ایک روز بورژوا سیاست میں سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کے کردار پر بحث کر رہے تھے میں نے ٹوکتے ہوئے کہا۔

دادا! میاں افتخار الدین کے بارے میں آپ کا خیال کیا ہے؟
کیا وہ سرمایہ دار اور جاگیردار نہیں؟ آپ نے انہیں کس اساس
پر لیڈر بنا رکھا ہے۔؟

کہنے لگے —— ہم نے انہیں لیڈر نہیں بنایا، یہ ایک ناگزیر مرحلہ ہے جس سے ہم گذر رہے ہیں۔ اس وقت کوئی دولت مند اگر ہمارے ہاتھ میں آکر ہمارے خیالوں کی اشاعت کا باعث بنتا، یا ہمارے ذہن کی معاونت کرتا ہے تو ہمیں اس کو ساتھ ملانے میں کوئی عیب نہیں۔ رہا اس پر اعتماد کا سوال تو یہ خارج از وجود ہے۔ ہم میاں صاحب پر کاملاً اعتماد نہیں کرتے لیکن ان سے

جس قدر فائدہ اٹھا سکتے ہیں، وہ اٹھا لینا چاہتے ہیں۔ میاں صاحب ہیں اپنے طبقے کی تمام تر برائیاں ہیں اگر آج پرولتاری انقلاب آ جائے تو سب سے پہلے جس شخص کا سر قلم کیا جائے گا وہ افتخار ہو گا۔

اتفاق سے اسی روز شام کو میاں صاحب مجھے دفتر چٹان سے بہ اصرار اٹھا کر لے گئے۔ میرے ان سے تعلقات محدود تھے کہنے لگے۔

"میں نے محسوس کیا ہے کہ دادا منصور جیسے لوگ بلائے بے درماں ہیں۔ یہی لوگ ہمارے تعلقات استوار نہیں ہونے دیتے اکثر و بیشتر چغلخوری کرتے ہیں"

میں نے ان کی بات توڑتے ہوئے کہا۔

"میاں صاحب آپ باہم دگر مخلص ہیں۔ لہٰذا میں اس معاملہ میں کوئی رائے نہیں دے سکتا"

اور میاں صاحب نے پینترا بدل لیا۔ عبداللہ ملک کا ذکر آ گیا، کہنے لگے۔

عبداللہ ملک، زور دے رہا ہے کہ میری سوانح عمری لکھے۔ کئی بار تقاضا کر چکا ہے، انگریزی تو وہ لکھتا نہیں اردو لکھتا ہے۔ کیسا لکھتا ہے؟

میں قدرے مسکرایا، عرض کیا۔

آپ کی سوانح عمری ضرور لکھی جانی چاہیئے۔ اول تو آپ خود اپنی یادداشتیں

لکھیں۔ نہیں تو جو کچھ پیش آچکا ہے وہ قلمبند کرادیں۔ ہمارے راہنماؤں میں یہ بڑی کمی ہے کہ وہ اپنے واردات نہیں لکھتے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ ہماری تاریخ افسانہ ہوتی جارہی ہے اور لوگ حقیقتوں کی بہ نسبت کہانیوں پر زیادہ بھروسہ کرتے اور ان میں دلچسپی لیتے ہیں۔ میاں صاحب نے اُس وقت تو حامی بھر لی لیکن اس سے پہلے کہ وہ اپنی کہانی لکھتے خود ایک کہانی ہو گئے۔ بلاوا آگیا اور چل بسے۔

میاں صاحب میں یقین و اعتماد کا فقدان تھا۔ اگر انہیں اپنی ذات پر اعتماد ہوتا اور وہ دولت کی ریل پیل سے ذرا ادھر ہوتے تو ان سے ملک و قوم کو بہت فائدہ پہنچ سکتا تھا۔ لیکن اس فقدان میں ان کا فی نفسہٖ کوئی تصور نہیں تھا۔ وہ بہ وجوہ خاص قسم کی ذہنی نشوونما سے اُبھرے تھے ابھی کم سن ہی تھے کہ ان کے والد کا انتقال ہوگیا۔ جائداد کورٹ آف وارڈ میں چلی گئی۔ جس برادری کے فرد تھے اُس سے ان کا مزاج مختلف تھا۔ جوان ہوتے کٹھ ملاؤں کے ہتھے چڑھ گئے وہاں شدید ردِعمل ہوا، مارکسزم کو اپنایا، لیکن نظری مطالعہ اور عملی تجربہ میں شب و روز کا فاصلہ ہے۔ اُن کے لاشعور میں لازماً یہ احساس تھا کہ انہیں ایک بڑا آدمی بننا چاہیئے۔ اس زبردست خواہش نے ان میں کہنی مار کر آگے نکلنے کی عادت پیدا کی۔ چونکہ والدین کے اکلوتے بیٹے تھے اس لیے آخر وقت تک انہیں اکلوتا رہنے کا احساس رہا۔ وہ دوستوں کے ساتھ بھی مسافرت کا سلوک کرتے، ان کے نزدیک

سیاسی ہمسفری بھی ٹرین کی دوستی تھی۔ جس طرح ایک ہی کمپارٹمنٹ کے مسافر مختلف عنوانوں پر گفتگو کرتے ہوئے اپنے اپنے اسٹیشن پر اُتر جاتے ہیں اسی طرح وہ اپنے ہمراہیوں سے دوستی رکھتے تھے لیکن ان کوتاہیوں اور کمزوریوں کے باوجود میاں صاحب کے اس کریڈٹ کو سلب نہیں کیا جاسکتا کہ انہوں نے اپنے طبقے کے خلاف بغاوت کر کے پروگریسو پیپرز جیسا عظیم ادارہ قائم کیا۔ اس ادارہ کو انہوں نے اپنے بیٹوں کی طرح پالا پوسا، پروان چڑھایا، نشوونما دی، جوان کیا اور جب اس کے پھل کھانے کا وقت آیا تو غاصب پیدا ہو گئے۔ میاں صاحب چاہتے تو بڑی بڑی ملیں بھی لگا سکتے تھے اُن میں ایک کاروباری انسان کی خصوصیتیں موجود تھیں۔ اپنے گردوپیش ملک کے کاروباری ادراک کو جمع کرنا ان کے لیے مشکل نہ تھا۔ ہمارا صنعت کار اور سرمایہ دار طبقہ اُن کے سامنے پیدا ہو کر عفریت بنا تھا۔ لیکن انہوں نے اپنے سیاسی ذوق کو ترجیح دی اور ملک کی ذہنی تربیت کے لئے دو عظیم اخباروں کو نکالا۔ اُن کا یہ کارنامہ معمولی نہیں حقیقت یہ ہے کہ اس باب میں کوئی شخص سارے ملک میں ان کا ہمسر نہ ہوا یہ خسارہ کا سودا تھا جو انہوں نے کیا۔ جس وقت یہ دونوں اخبار ان کے قبضہ میں تھے اُس وقت بھی خسارے کا سودا تھا۔ گو ان کی معرفت یا ان کی طاقت سے وہ بہت کچھ کماتے تھے لیکن اخبارات میں ان کے لیے مقابلۃً خسارہ ہی تھا فائدہ تھا تو یہ کہ لاکھوں انسان ان سے بالواسطہ و بلاواسطہ متاثر ہوتے تھے جب یہ

اخبار ان سے چھن گئے خواہ ان کی اولاد کو حصص کی ملکیت کا چالیس پنیتالیس لاکھ روپیہ مل گیا لیکن یہ ان کے لیے جان لیوا خسارہ تھا۔ ان کے خواب وخیال میں بھی نہ تھا کہ یہ حادثہ پیش آسکتا ہے۔ حادثہ یکایک پیش آگیا۔ وہ سوکر اٹھے تو انہیں معلوم ہوا کہ پروگریسو پیپرز لمیٹڈ کے دفاتر اور اس کے اہتمام میں نکلنے والے اخبارات پر مارشل لا۔ کی حکومت نے قبضہ کر لیا ہے۔ اس صورت حال نے ان پر شدید اثر کیا، مُعاملہ اُن کا یہ ہوگیا ؎

غنی روزِ سیاہ پیرِ کنعاں را تماشا کُن
کہ نورِ دیدہ اش روشن کند چشم زلیخارا

حکومت نے اس پر بھی بس نہ کیا، افتاد آتی ہے تو سارے بند ٹوٹ جاتے ہیں۔ میاں صاحب اب تک چین سے کوئلہ اور یورپ کے کمیونسٹ ملکوں سے نیوز پرنٹ درآمد کرتے تھے، اُن کے لائسنس بھی منسوخ ہو گئے۔ انگلستان میں میاں صاحب کے کئی لاکھ پونڈ جمع تھے۔ مارشل لا۔ کی حکومت نے جب بیرونی خفیہ سرمایہ کو طلب کیا تو دوسرے صنعت کاروں کی طرح میاں صاحب کو بھی یہ روپیہ اگلنا پڑا۔ شالامار باغ کے آمنے سامنے میاں صاحب کی بہت بڑی اراضی تھی عام حالات میں اُس سے لاکھوں روپے حاصل ہو سکتے تھے حکومت نے ترقیاتی سکیم بنا کر قبضہ کر لیا۔ اتنی تھوڑی قیمت لگائی کہ میاں صاحب کو اس کا بجا طور پر قلق تھا اور یہ سب میاں صاحب کو ان کے سیاسی خیالات کی سزا

دی جا رہی تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ صدمات معمولی نہ تھے بلکہ غیر معمولی تھے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ میاں صاحب کے دل کا مرض عود کر آیا۔ وہ ایک لٹے ہوئے عیش کی تصویر ہو گئے۔ روپیہ پیسہ اُن کے ہاں اب بھی عام تھا لیکن ان کے دل میں یہ زبردست احساس مرض بن گیا تھا کہ ملک کا پانسہ پلٹ چکا اور راہوار سیاست ان کے قابو سے باہر ہے۔ پاکستان اس لئے نہیں بنا تھا کہ اس کی آزادی اغوا ہو جائے اور چند لوگ اپنے آپ کو عقل کل سمجھ کر اس پر مسلط ہو جائیں، یہی احساس انہیں آخر وقت تک ستاتا رہا۔ حمید نظامی مرحوم سے اُن کے تعلقات کبھی خوشگوار نہ رہے تھے وہ انہیں رگیدتے ہی رہے۔ میاں صاحب نے بھی اُن کے خلاف محاذ باندھے رکھا لیکن اس افتاد نے دونوں کو اکٹھا کر دیا۔ ایک روز میاں صاحب ان کے دفتر میں آ گئے، کرسی سے اٹھایا، نیچے ہیکو میں کافی پلانے لے آئے۔ مارشل لاء کے برگ و بار پر گفتگو کی۔

یہ زمانہ مارشل لاء کے ختم ہونے کا تھا۔ چند روز میں نئے آئین کا اعلان ہو رہا تھا۔ میاں صاحب کا خیال تھا ایک ہو کر جدوجہد کریں۔ مجھے بھی دفتر چٹان سے بلوا لیا۔ بہت دنوں کے بعد دیکھا تو معلوم ہوا کہ میاں صاحب بہت جھڑ ہو چکے ہیں۔ چہرے پر وہ روغن ہی نہیں رہا، آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی ہیں، لاغر تو پہلے ہی سے تھے اب مشت استخوان ہیں۔ تاہم اُن کا حوصلہ جوں کا توں تھا۔ وہ تمام چوٹیں کھا کے بھی توانا ہی تھے۔ گو محسوس ہوتا تھا کہ ان چوٹوں کا صدمہ انہیں اندر ہی اندر

کھا رہا ہے اور وہ گھن کی طرح پس رہے ہیں۔ ہیکو سے نکلے تو مجھے بہ اصرار موٹر میں بٹھا کر بنگلہ پر لے گئے۔ ایک طرف لان میں دو کرسیاں بچھوا دیں باتیں شروع کیں۔

م۔ "کچھ ہونا چاہیئے"۔

ش۔ "کیا ہونا چاہیئے"؟

م۔ "مارشل لا ختم ہو رہا ہے"۔

ش۔ "ہونے دیجیے لیکن ابھی تو مہینوں کی بات ہے"۔

م۔ "بہر حال اگلے سال ۲۳ مارچ کو نئے آئین کا اعلان ہو رہا ہے"۔

ش۔ "نئے آئین میں کیا ہوگا"۔

م۔ "کچھ تو ہوگا"۔

ش۔ "کیا ہوگا؟ آخر آپ تو باخبر حلقوں سے ملتے جلتے ہیں"۔

م۔ "واضح بات تو ابھی تک معلوم نہیں ہوئی لیکن مارشل لا ختم ہو جائے گا"

ش۔ میاں صاحب! آپ جہاندیدہ بلکہ سرد و گرم چشیدہ انسان ہیں۔ آپ کی سیاسی تربیت جس نہج پر ہوئی ہے اور آپ نے سیاسیات کے جن شب و روز میں زندگی گذاری ہے، اُن کا اقتضا ہے کہ آپ خوش خیالی میں نہ رہیں اور نہ خوش فہمی کا شکار ہوں، نیا آئین جن بزرجمہروں نے بنایا ہے۔ آپ بھی انہیں جانتے ہیں۔ وہ لوگ کب عوام دوست رہے ہیں۔ انہیں کس زمانہ میں تاریخ کا شعور ہوا، انہوں نے

آزادی کے لیے کیا اور کب جد و جہد کی؟ پھر یہ ملک جس میں ہم رہتے ہیں اس کے عوام میں کتنے لوگ سیاسی ذوق رکھتے ہیں؟ ہماری پہلی لیڈر شپ نے ان کے لئے کب تربیتی فضا پیدا کی؟ آپ تاریخ کے پیمانوں کو ان عوام پر ناپ نہیں سکتے۔ یہاں ابھی ایک ایسی جد و جہد کی ضرورت ہے جو طویل عمر چاہتی ہے۔ پاکستان اسلامی ملکوں سے مختلف نہیں وہ انھی ملکوں کی طرح ایک اسلامی ملک بن رہا ہے جو اس وقت نقشہ عالم پر موجود ہیں۔ اور جن کے حکمرانوں کو عوام سے اتنا ہی تعلق ہے جتنا ماش کے دانہ پر سفیدی ہوتی ہے۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ جن لوگوں نے پانچسال تک مارشل لا نافذ کئے رکھا اور ملک میں کتا بھی نہیں بھونک سکا۔ وہ اتنے فیاض ہو گئے ہیں کہ اب آپ کو آزادی کا تحفہ نذر کریں گے۔ اور آپ اُس جمہوری آئین سے متمتع ہوں گے جس جمہوری آئین سے کبڈی کھیلنے کی بدولت یہ دن دیکھنے نصیب ہوتے ہیں۔

م۔ "لیکن عوام بھی تو کوئی چیز ہیں"

ش۔ معاف کیجئے میاں صاحب آپ ہمیشہ کتابی باتیں کرتے ہیں۔ آپ کن عوام کی باتیں کرتے ہیں۔ پاکستان کے عوام کی؟

م۔ لیکن اس میں عوام کا قصور نہیں ان کی تربیت ہی صحیح خطوط پر نہیں ہوئی ہے۔

ش۔ جہاں تک اِس خیال کا تعلق ہے۔ مجھے آپ سے اتفاق ہے لیکن میں

اُس مواد پر بحث کر رہا ہوں جو ہمارے پاس موجود ہے۔ پاکستان کے عوام بے حس ہو چکے ہیں۔

م۔ اس کا ذمہ دار کون ہے؟

ش۔ عوام بھی اور اس کے راہنما بھی۔

م۔ کیا صرف راہنما ہی نہیں؟

ش۔ صرف راہنما بھی ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ تربیت کی ذمہ داری ان پر عائد ہوتی ہے لیکن عوام کو بری الذمہ بھی قرار نہیں دیا جا سکتا۔

م۔ تو گویا آپ عوام سے مایوس ہیں۔

ش۔ ایک حد تک۔

م۔ لیکن میں اس کا ذمہ دار لیڈروں کو ٹھہراتا ہوں۔

ش۔ میاں صاحب وہ لیڈر کون تھے۔ کیا آپ ان کی صف میں نہیں؟ اگر آپ ناراض نہ ہوں تو آپ کو اپنا سمجھ کر گستاخی کروں۔

م۔ ضرور

ش۔ کیا یہ واقعہ نہیں کہ اس سے پہلے جب بھی ملک پر اُفتاد آئی یا اس قسم کے حالات پیدا ہوئے کہ صحیح خطوط پر انقلابی آب و ہوا پیدا ہو۔ آپ ملک سے باہر چلے گئے اور مہینوں غیر حاضر رہے۔

م۔ تو گویا آپ مجھ سے متفق نہیں ہیں؟

ش۔ میاں صاحب! سوال اتفاق کا نہیں اس قسم کا اتفاق بے معنی ہے
مجھے قنوطی کہہ لیجئے لیکن پاکستان کے عوام سے مجھے سخت مایوسی ہے۔

م۔ آپ تاریخ کے تدریجی ارتقا پر یقین نہیں رکھتے!

ش۔ نظریاتی بحث نہ چھیڑیئے میں ان پاکستانی عوام کے دل و دماغ کی بات
کر رہا ہوں جن میں صدیوں سے غلامانہ ذہنیت راسخ ہو چکی ہے۔

م۔ تو پھر آپ کا خیال ہے کہ ہم لوگ پاؤں توڑ کر بیٹھ جائیں۔

ش۔ فی الحال تو یہی خیال ہے۔

م۔ تو ان حالات میں آپ کا قومی تجزیہ کیا ہے۔

ش۔ قومی تجزیہ سے آپ کی مراد کیا ہے؟

م۔ یعنی آپ پاکستان کے بارے میں کیا محسوس کرتے ہیں۔

ش۔ میاں صاحب! ہمارے ہاں کوئی لیڈرشپ نہیں۔ صرف اقتدار کا نام
راہنمائی ہے۔ کوئی ایسا شخص نہیں جس کی ذات سیاسی جدوجہد میں بکمال و تمام مرکز و
محور بن سکے۔ یوں کہیئے کہ اس وقت ملک میں کوئی گاندھی اور قوم میں کوئی جناح
نہیں۔ مڈل کلاس تاریخی فیصلہ کے مطابق ابن الوقت ہے۔ متروکہ املاک نے
لوگوں کو خودغرض اور قیام پاکستان کے مادی فوائد نے انہیں اجتماعی مفاد سے
دور کر دیا ہے —— بقول اقبال ؎

کہاں سے آئے صدا لا الٰہ الا اللہ

میاں صاحب نے اپنی عادت کے مطابق زور کا قہقہہ لگایا اور قہقہہ لگاتے وقت وہ انگریزی کے ہندسے 8 کی طرح ہو جاتے تھے۔

م۔ تو گویا آپ نے بات اقبال پر ختم کر دی۔ وہ بھی ایک شاعر تھا آپ بھی ایک شاعر ہیں اور شاعر ہمیشہ قنوطی ہوتے ہیں۔

ش۔ میاں صاحب اس قصہ ہی کو چھوڑیئے، نیل دیکھئے نیل کی دھار دیکھئے آئین کا اعلان ہو لے پھر جائزہ لے کر سوچیں گے کہ اُن حالات میں کیا ہو سکتا ہے۔

م۔ تو حاصل کلام یہ کہ فی الحال سوچنا بھی ترک کر دیں۔

ش۔ میرا خیال تو یہی ہے، عجب نہیں نئے آئین میں سوچنا بھی جرم ہو اور کسی وقت آپ اخبار میں خبر پڑھیں کہ ایمپرس روڈ پر ایک آدمی سوچتا ہوا پکڑا گیا۔

میں لوٹ رہا تھا تو میں نے محسوس کیا جیسے میں میاں صاحب کے ٹوٹے ہوئے دل کو توڑ آیا ہوں۔ مجھے ان سے اس قسم کی باتیں کرنی چاہئیں تھیں یا نہیں! میرا ذہن آزردہ تھا کہ میاں صاحب اب ایک گرتی ہوئی دیوار ہیں، صبح گئے یا شام گئے۔ باتیں تو ہمیشہ ہی کی طرح کرتے تھے لیکن امیدوں پر جی رہے تھے۔ جو کہتے اور کرتے تھے محض جی بہلانے کے لیے۔

یہ ایک فوری تاثر تھا جو میرے دل میں پیدا ہوا پھر عنقا ہو گیا۔ میری نگاہ میں میاں صاحب کا پرانا چہرہ ہی تھا جو ان کی سیاسی عادتوں کے باعث خراب ہو چکا

تھا۔ اور میں اُن سے اس حالت میں بھی دل کی بات کہتے ہوتے ہچکچاتا تھا۔ مجھے کماحقہ معلوم تھا کہ میاں صاحب روحانی قدروں پر یقین نہیں رکھتے وہ تاریخ کے مادی نظریہ پر یقین رکھتے اور اسی کے ہو کر رہ گئے ہیں۔ ان کی صحت منزور ہلی ہوتی ہے اور انہیں صدموں نے گھیر رکھا ہے لیکن وہ دماغاً" ان کمیونسٹوں کا عکس ہیں جو اپنے سوا کسی شخص کے اخلاص و ایثار کو نہیں سراہتے ۔۔ نہ اُن پر بھروسہ کرتے اور نہ اُن کے افکار کو تسلیم کرتے ہیں۔

جس زمانہ میں تقسیم ملک کے فسادات ہو رہے تھے اور ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کا دن قریب آرہا تھا، جے پرکاش نارائن سوشلسٹوں کی دعوت پر لاہور آئے۔ پروفیسر تلک راج چڈہا اور منشی احمد دین نے میرا اُن سے بھرپور تعارف کرایا۔ وہ فسادات کی سنگینی کو روکنے کے لیے پنجاب کے مسلم لیگی لیڈروں سے ملنا چاہتے تھے۔ منشی جی نے مجھے کہا، کوئی راستہ پیدا کرو، میں نے کہا، میاں افتخار الدین سے بات ہو سکتی ہے، چنانچہ میں میاں صاحب کے ہاں گیا، انہوں نے کہا۔ آج شام چھ بجے میری کوٹھی پر چلے آؤ۔ تمام لیگی راہنماؤں کو اکٹھا کر لوں گا۔ میں نے جے پرکاش سے کہا وہ تیار ہو گئے۔ پانچ بجے شام فلیٹی میں استقبالیہ تھا۔ تمام پریس مدعو تھا جے پرکاش نارائن نے کہا کہ وہ ابھی چھ بجے لیگ کے لیڈروں سے مل رہے ہیں۔ اس کے بعد صورت حال پر کوئی بیان دے سکیں گے۔

جے پرکاش اور میں میاں صاحب کے ہاں پہنچے تو میاں صاحب اپنے باغ

میں ٹہل رہے تھے۔ جے کاش سے مصافحہ کیا لیکن اس میں سرد مہری تھی۔

جے پرکاش! باقی لیڈر کہاں ہیں؟

میاں صاحب ، کون؟

جے پرکاش! مسلم لیگ کے صوبائی راہنما۔

وہ یہاں کیوں ہوتے؟

جے پرکاش نے میری طرف دیکھا، میں نے میاں صاحب سے مخاطب ہو کر کہا۔

"آپ نے انہیں اپنے ہاں مدعو کرنے کا وعدہ کیا تھا"

"میں نے کوئی وعدہ نہیں کیا تھا"

میں کٹ کے رہ گیا۔ میاں صاحب سے اس سفید جھوٹ کی توقع نہ تھی۔ بہرحال ان سے کچھ کہنا بے فائدہ تھا۔ جے پرکاش اُلٹے پاؤں واپس آگئے میاں صاحب کی چائے بھی نہ پی، فلیٹیز تک خاموش رہے۔ پھر فرمایا کہ تم محسوس نہ کرو میں تم سے زیادہ افتخار الدین اور ان کی عادتوں کو جانتا ہوں۔ بہت دنوں بعد خلوتیان راز سے پتہ چلا کہ میاں صاحب کو کمیونسٹوں نے روکا تھا۔ کہ وہ جے پرکاش کو نظر انداز کریں۔ کیونکہ جے پرکاش کی سوشلسٹ پارٹی اور ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی میں خوفناک دشمنی تھی۔ دونو ایک دوسرے کے خلاف شرمناک الزام عائد کرتے تھے۔

میں اپنے طور پر سخت مضمحل تھا کہ میاں صاحب نے میری پوزیشن بلاوجہ خراب کی۔ اس کے بعد میں نے میاں صاحب پر کبھی اعتماد نہیں کیا۔ مجھے ہر معاملہ میں اُن کے قول و فعل میں تامل ہوتا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ میاں صاحب سے ہمیشہ سیاسی طور پر کھٹا چھینی رہی۔ ہم آپس میں ملتے بھی تو اس میں دوستانہ اخلاص نہیں ہوتا تھا۔

خان عبدالغفار خاں رہا ہوئے تو میرے ہاں قیام کیا۔ میاں صاحب کے لئے یہ ایک سانحہ تھا ایک تو یہ ان کی دولت کے رخسار پر طمانچہ تھا دوم ان کی شخصیت کو ہلکا کرتا تھا، سوم ان کے لاشعور میں تھا کہ میزبانی صرف اُن کا حق ہے چہارم میرے اور میاں صاحب کے درمیان ان دنوں کشیدگی کے جذبات اوج پر تھے۔ بادشاہ خان سے میں صرف ایک ہی دفعہ ملا تھا۔ میری اُن سے کوئی خاص رسم و راہ نہ تھی۔ اوّل اوّل چٹان ہی تنہا اخبار تھا جس نے اُن کے حق میں لکھنا شروع کیا۔ اُن کے بارے میں بعض صراحتی بیان بھی چٹان ہی نے شائع کئے اُن کے داماد محمد یحییٰ جان نے حکومت کو ایک وضاحت نامہ لکھا —— وہ اس کو پمفلٹ کی شکل میں شائع کرنا چاہتے تھے لیکن پاکستان ٹائمز پریس نے چھاپنے سے انکار کر دیا۔ یہ خدمت بھی اُردو پریس نے انجام دی جو اُس وقت میرے علاوہ مسٹر حمید نظامی، شیخ حامد محمود اور چوہدری عبدالحمید کی مشترکہ ملکیت میں تھا۔ میں نے حکومت کے ہوم سیکرٹری کو لکھا کہ عید کے روز میری

بچی شائستہ (بعمر دس سال) بادشاہ خان کو کھانا پہنچانا چاہتی ہے۔ وہ ہسپتال میں ہیں، اجازت دی جائے۔ یہ اجازت آگئی، حسن اتفاق سے جس سپرنٹنڈنٹ پولیس اور اُس کی ہدایت پر جس انسپکٹر پولیس کی ڈیوٹی لگی وہ دونو میرے دوست تھے ان کی بدولت بادشاہ خان سے بغل گیر ہونے کا موقع مل گیا۔

یہ میری ان سے پہلی ملاقات تھی۔ غالباً اس احساس ہی نے انہیں میرے ہاں قیام پر آمادہ کیا۔ لاہور ریلوے اسٹیشن پر ٹرین پہنچی تو استقبال کے لیے بہت بڑا ہجوم تھا۔ میاں صاحب بھی اپنے دوستوں کے ہمراہ موجود تھے۔ بادشاہ خان نے تھرڈ کلاس کے ڈبے سے اُترتے ہی اپنے سامان کی گٹھڑی عبدالسلام ندوی کے حوالے کی۔ اور اُن سے کہا کہ میں شورش کے ہاں ٹھہروں گا۔ میاں صاحب پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ وہ مصافحہ کر کے چلے گئے۔ اگلے روز اُن کے استقبال کی خبر چھپی تو پاکستان ٹائمز اور امروز میں میرا نام ہی غائب تھا۔ یہ بھی درج نہ تھا کہ وہ شورش کے ہاں ٹھہرے ہیں، حالانکہ دوسرے تمام اخبارات نے تحریر کیا کہ بادشاہ خان نے شورش کاشمیری کے ہاں قیام کیا ہے۔ میاں صاحب نہیں چاہتے تھے کہ بادشاہ خان کے لاتعداد ارادتمندوں کو معلوم ہو کہ وہ شورش کاشمیری کے مہمان ہیں۔ انہوں نے اِسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ میرے خلاف اپنے حواریوں سے پخت و پز کر کے افسانہ طرازی کی مہم شروع کر دی۔ انہی دنوں میرے استحقاق کی بنا پر ——— مجھے ایک مکان الاٹ ہوا تھا۔

ملک غلام جیلانی جو اس وقت اپوزیشن کے لیڈر رہیں۔ اور ان سطور کے لکھتے وقت نظر بند ہو کر میو ہسپتال لاہور میں زیر علاج ہیں۔ اُن دنوں علاقہ کے بحالیاتی آفیسر تھے۔ اُن کی دوستانہ مساعی کے باعث مجھے یہ مکان ملا تھا وہ اب بھی بتا سکتے ہیں کہ یہ سب کچھ انہی کی وجہ سے ہوا تھا۔ انہیں کسی نے اشارہ بھی نہیں کیا تھا بلکہ جب یہ مکان مجھے مل گیا تو چیف ری ہیبلی ٹیشن کمشنر نے اپنے ایک ہم زبان دوست کو منتقل کرنا چاہا۔ ایک دوسرے سی ایس پی افسر نے مداخلت کی کہ اس کے دوست کو مل جاتے، لیکن میاں صاحب کے دستر خوانیوں نے وہ خبریں وضع کیں کہ ان کا ذکر کرتے ہوتے قلم کو حجاب آتا ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ اس مہم میں بعض دوست بھی شریک ہو گئے اور میں اُن کا نام لے کر انہیں رسوا کرنا نہیں چاہتا بہر حال جس کے منہ میں جو بات آئی کہہ ڈالی، ان باتوں کا خلاصہ یہ تھا کہ

- گورمانی صاحب نے اسی مقصد کے لیے مجھے یہ مکان لے کر دیا ہے
- بادشاہ خاں کے رہائشی اخراجات بھی سرکار کی مد میں سے وہی ادا کر رہے ہیں۔
- اُن کا خیال ہے کہ اس طرح بادشاہ خان کے ملاقاتیوں اور ان کے خیالوں سے کما حقہٗ آگاہی ہو سکے گی۔

بادشاہ خاں کوئی دو اڑھائی ماہ میرے ہاں رہے۔ میاں صاحب ان سے ملنے تک نہ آئے۔ اِدھر بادشاہ خان کے کانوں میں یہ بات ڈالی گئی کہ میاں صاحب

شورش کے مکان پر کبھی نہیں آئیں گے۔ لیکن بادشاہ خان نے وضعداری قائم رکھی اور اس قسم کی باتوں کو سن سنا کر بھول جاتے رہے۔ بلکہ مسکرا دیتے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ بادشاہ خان کی میزبانی میری استطاعت سے باہر تھی۔ گو میرے لئے یہ سرمایۂ فخر تھا لیکن میں اُن کا میزبان بننے کے اہل نہ تھا۔ وہ سات آٹھ برس بعد رہا ہوتے تھے سارا سرحد ٹوٹ پڑا تھا۔

لاہور اور بیرون لاہور کے سینکڑوں لوگ ان کی ملاقات کو آتے رہے۔ میں اپنی طبیعت سے مجبور تھا کہ مدارات کروں ؟ میں نے بہت سی دعوتوں کا اہتمام کیا۔ مہینہ بھر صبح کے ناشتہ سے لے کر رات کے کھانے تک ان سے ملنے والوں کو مبادلہ افکار کے لیے جمع کرتا رہا۔ اخبار نویسوں کو باری باری مدعو کیا۔ سرحد کے خاں آتے تو انہیں مدعو کرتا۔ لیکن میاں صاحب اور ان کے وظیفہ خوار گماشتوں کی فوج ظفر موج برابر میرے خلاف زہر اگلتی رہی۔ میں نے اپنے طور پر بادشاہ خاں اور ان کے اعزہ کی مہمانداری میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ استطاعت کے مطابق جو ہو سکتا تھا کیا، مجھے یاد ہے کہ مہمانی کی وسعت کی تاب نہ لا کر میں نے اپنی بیوی کی بالیاں، گلے کا ہار اور ہاتھوں کی چوڑیاں بھی فروخت کر دی تھیں۔ لیکن میاں صاحب اور اُن کے حواریوں کی زبانیں کترنی کی طرح چلتی رہیں۔ اس چیز نے مجھے میاں صاحب کے معاملہ میں تلخ کر دیا۔

کتنے مہینوں کے بعد ایک دن میاں صاحب اچانک آوارد ہوتے اس

وقت بادشاہ خان اکیلے تھے اور صرف میں ہی اُن کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ ان کے قدم رکھتے ہی میں باہر نکل گیا۔ پون گھنٹہ گذرا ہوگا۔ ملازم نے کہا بادشاہ خان بلاتے ہیں۔

میں اندر گیا تو میاں صاحب اور وہ ایک ہی صوفہ پر شانہ بشانہ بیٹھے تھے میں نے میاں صاحب کو ریسیٹنگ نہ دی۔ بادشاہ خان نے کہا۔

"میاں صاحب سے تمہارا اختلاف کیا ہے"؟

"ان سے پوچھئے"

"وہ تو کہتے ہیں کہ مجھے کوئی اختلاف نہیں ہے"۔

جی ہاں! "انہیں اختلاف نہیں عناد ہے"۔

"تمہیں کیا شکایت ہے"؟

"کوئی شکایت نہیں"

"تو پھر تم آپس میں کھچے ہوتے کیوں ہو"؟

"ان سے پوچھئے"۔

"سیدھی بات کرو کہ شکایت کیا ہے"؟

شکایت نہیں شکایت تو وہاں ہوتی ہے جہاں تعلق خاطر ہو۔ میری ان کے متعلق حکایت ہے۔

"حکایت"؟

جی ہاں۔

تو وہ کیا ہے؟

"ایک دولت مند اور ایک فقیر میں کوئی تعلق نہیں ہو سکتا۔"

میاں صاحب اس سارے عرصہ میں چپ بیٹھے رہے۔ ایک آدھ دفعہ بولنا چاہا لیکن بادشاہ خان نے روک دیا۔ آخر میاں صاحب نے مہر توڑی۔

آپ کا مطلب کیا ہے؟

میاں صاحب مطلب بالکل واضح ہے میں کوئی بجھارت بیان نہیں کر رہا۔

"میرے لیے بجھارت ہے۔"

اگر آپ دل کو ٹٹولیں تو ہر چیز سامنے آجائے گی اور اب بھی آپ کے دل کو معلوم ہے کہ آپ نے میرے ساتھ جو کچھ کیا وہ افسوسناک ہی نہیں بھیانک بھی ہے۔

میں نے وہ تمام باتیں جو میرے خلاف اڑائی جا رہی تھیں ایک ایک کر کے کہنی شروع کیں تو میاں صاحب بڑے حوصلے سے انکار کرتے رہے اور جب میں نے پاکستان ٹائمز اور امروز کا رویہ بیان کیا تو اس سے بھی مکر گئے بلکہ اپنے مدیروں اور رپورٹروں کو گالیاں دینے لگے کہ ان کے اپنے دماغوں کی شرارت ہے۔

"تو کیا آپ اپنے اخبار بھی نہیں پڑھتے؟"

"عموماً یہی ہوتا ہے"

میاں صاحب کو معلوم تھا کہ وہ جھوٹ بول رہے ہیں۔ بادشاہ خان بھی سمجھتے تھے کہ شورش اس معاملہ میں راستی پر ہے اور مجھے بھی یقین تھا کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں اس میں شک کا شائبہ نہیں؟ لیکن بات اس پر ختم ہو گئی کہ میاں صاحب آئندہ شکایت کا موقع نہ دیں گے۔ یہ اُن کا ہوائی وعدہ تھا۔ اگلے روز ہی خواب ہو گیا۔ بادشاہ خان مجھے ساتھ لے کر پاکستان ٹائمز کے دفتر میں پہنچے۔ وہاں بہت سی تصویریں اُتروائی گئیں۔ میاں صاحب نے فوٹوگرافر کو بلوا کر بیسیوں پوز بنواتے، لیکن صبح کے اخبار میں وہی پوز چھپا جس میں میاں صاحب اور اُن کا عملہ موجود تھا جہاں جہاں میری تصویر تھی اُس کو کاٹ دیا گیا۔

میاں صاحب اس فن میں بڑے ماہر تھے اُن پر کوئی احتساب نہیں تھا وہ جانتے تھے کہ پاکستان ٹائمز اور امروز ان کی ریاست ہیں اور باقی تمام لوگ ان کی رعایا ہیں۔

قاضی عطاء اللہ جان بادشاہ خان کے سمدھی اور سرحد کی خان وزارت میں وزیر مالیات تھے۔ انہیں بھی خان عبدالقیوم خان نے جیل میں ڈالا تھا،

ان کا لاہور میو ہسپتال میں انتقال ہو گیا۔ میاں افتخار الدین کو پتہ چلا تو چار آدمی اکٹھے نہ کر سکے۔ دادا فیروز الدین منصور کو میرے پاس بھیجا۔ دادا نے میاں صاحب کا پیغام دیا کہ چند آدمی ساتھ لے کر آؤ تا کہ ان کی لاش کو قدرے اعزاز کے ساتھ مردان بھجوانے کا انتظام ہو سکے۔ میں چند ایک نوجوان ساتھ لے کر ہسپتال پہنچا قاضی صاحب ہمیشہ کی نیند سو چکے تھے۔ اُن کی اشکبار بیوہ ان کے سرہانے کھڑی تھیں۔ اُن کی نعش کو نہلایا، دھلایا، کفنایا اور دفنانے کے لیے ایک ایمبولینس میں مردان روانہ کر دیا۔

اگلے روز پاکستان ٹائمز میں تصویر چھپی تو میاں صاحب شہ سرخی میں موجود تھے میں نے بادشاہ خان سے اس واقعہ کا بھی ذکر کیا۔ لیکن میاں صاحب بہر حال میاں صاحب تھے بادشاہ خان اُن کے قائد نہ تھے۔

میرا خیال ہے میاں صاحب کو بڑی حد تک ان کے گرد و پیش کے لوگوں نے بھی خراب کیا تھا۔ ایک تو جیسا کہ عرض کیا اُن کی طبیعت میں توازن نہیں تھا اور وہ ایک سیمابی لب و لہجہ رکھتے تھے۔ دوسرے کیمونسٹوں نے ان کو اپنے مقاصد کے لیے آلہ کار بنا رکھا تھا ــــ اُن کی بدولت کیمونسٹوں کے بیرونی رشتے قائم تھے ــــ اور وہ اُن کے روپے پیسے سے متمتع ہوتے تھے۔ ازراہ مذاق ہم لوگ جب ان کیمونسٹوں کو ان کے دستر خوان کا طعن دیتے تو وہ اسے اپنا حق سمجھتے اور کہتے کہ ہم اپنا ہی کھاتے ہیں۔

میاں صاحب اندر خانہ ان لوگوں کے گلہ گذار بھی تھے۔ انہیں اس امر کا بخوبی احساس تھا کہ پاکستان ٹائمز کو جس نہج پر یہ لوگ لے جا رہے ہیں، ایک دن اُس کا نتیجہ خطرناک ہوگا۔ لیکن اپنے احساس کا اظہار تو کرتے مزاحمت یا مدافعت نہ کرتے حقیقت یہ ہے کہ ہم لوگ ان کی طبیعت کے تضاد کی توجیہہ یا تفسیر کرنے سے قاصر تھے۔ اُن کے سیاسی علیبوں اور مجلسی چونچلوں پر ان کی عظیم دولت نے اِخفاو مصلحت کی ریشمی نقابیں ڈال رکھی تھیں۔

پاکستان میں ترقی پسند مصنفین کو میاں صاحب نے بڑا اسہارا دیا، بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ جہاں تک اس تحریک کے اُچھالنے کا تعلق ہے وہ اس کا نصف تھے۔ خود وہ کوئی مصنف یا مولف نہ تھے۔ قلم سے بھی انہیں دُور کا تعلق نہ تھا، زبان و بیان سے بھی ناواقف تھے۔ شاعری اُن کے احاطہ فہم سے باہر تھی۔ اُردو کے بارے میں تو وہ کچھ جانتے ہی نہیں تھے۔ امروز نکالا تو فیض احمد فیض کو اُس کا چیف ایڈیٹر اور چراغ حسن حسرت کو ایڈیٹر بنا دیا۔ پروفیسر محمد سرور اور محمد ایوب کرمانی ادارۂ تحریر میں لیے گئے۔ لیکن شروع سال ہی میں امروز کے عملہ ادارت میں تو تکار شروع ہوگئی۔ حسرت صاحب نے پہلے تو فیض صاحب کو لیا کہ وہ انگریزی کے ایڈیٹر ہیں اُردو کے نہیں۔ فیض مان گئے اور اس طرح حسرت مدیر سردبیر ہو گئے۔ کوئی شخص حسرت کو آسانی سے بچتا نہیں تھا۔ انھوں نے پروفیسر سرور

پر بالادستی قائم کرنی چاہی۔ سرور امروز کا اداریہ لکھتے تھے دونوں میں تکرار ہوگئی اس تکرار میں میاں صاحب دوغلہ ہوگئے۔ حسرت سے ملتے تو کہتے۔

"جی ہاں میں نے آج تک امروز کا اداریہ نہیں پڑھا، اس میں حرارت ہی نہیں ہے"۔

سرور سے ملتے تو فرماتے۔

"حسرت صاحب جاگیرداروں کی زبان لکھتے ہیں انہیں احساس ہی نہیں کہ لاہور میں لکھنؤ کی بولی ٹھولی نہیں چلے گی، فسانہ آزاد کی زبان تو بہت پرانی ہو چکی ہے"۔

حسرت صاحب اس لئے جیت گئے کہ ترقی پسند اُس وقت اُن کیساتھ تھے۔ سرور صاحب استعفیٰ دے کر چلے گئے، پھر جانے کیا پیچ پڑا کہ ایوب کرمانی صاحب کو بھی امروز سے رخصت ہونا پڑا۔ وہ عقیدۃً پکے کمیونسٹ تھے امروز چھوڑا تو میاں صاحب کو جھولیاں بھر بھر کر بددعائیں دیں۔ لاہور سے جاکر سندھ گورنمنٹ میں ڈائریکٹر تعلقات عامہ ہوگئے۔ نوجوانی ہی میں شراب کی لت پڑ گئی۔ تو ایک روز اتنی پی کہ ہوٹل سے چھلانگ لگاکر رحلت کر گئے۔

حسرت صاحب اَنا کے پتلے تھے انہیں یقین تھا کہ امروز ان کے دم قدم سے ہے میاں صاحب اپنے طور پر مطمئن تھے کہ امروز اُن کا ہے۔ کیونکہ روپیہ اُن کا تھا۔ ایک دن میاں صاحب حسرت صاحب سے کہہ بیٹھے۔

"حسرت صاحب یہ جو آپ پرانی اُردو لکھتے ہیں تو یہ اس زمانے کی اُردو نہیں ہے"۔

حسرت صاحب بگڑ گئے یہ خیال کئے بغیر کہ میاں صاحب مالک ہیں اُنہیں فوراً ہی ڈانٹ دیا۔ نتیجۃً حسرت صاحب کو نوکری سے ہاتھ دھونا پڑا۔ میاں صاحب کا خیال تھا کہ حسرت صاحب کا قلم گھس چکا ہے وہ عوامی زبان میں لکھتے بولتے نہیں ہیں۔

حسرت صاحب دوستوں کے حلقہ میں میاں صاحب کو دولت کا سانحہ قرار دیتے، طرح طرح کی پھبتیاں کستے، پھر فرماتے کہ میاں صاحب تو درزی کی سوئی ہیں کبھی گاڑھے کبھی کمخواب اُن کی اپنی کوئی راستے نہیں، وہ اشتمالی کوچہ گردوں سے راستے لے کر اپنی کلاہِ افتخار میں سجاتے ہیں۔ اخبار تو انہوں نے حکمرانوں کو مرعوب کرنے اور اپنے کاروبار کی راہیں کھولنے کے لیے نکال رکھے ہیں۔

کبھی انہی میاں افتخار الدین کے لیے حسرت نے زمانے بھر سے لڑائی باندھ رکھی تھی حتیٰ کہ اُن دوستوں کو بھی تیاگ دیا تھا جن کے عمر بھر ہم نوالہ و ہم پیالہ رہے تھے تاثیر مرحوم سے انہوں نے گھمسان کا یدھ کیا صرف اس شعر پر اچھا خاصا مجادلہ ہو گیا ؎

عجیب بات یہ جنتا کا یار کہتا ہے
کہ شعر وہ ہے جو فتو لہار کہتا ہے

تاثیر نے اس غزل نما نظم میں میاں افتخار الدین اور ان کے حواریوں کو ہلکی پھلکی طنزوں کا نشانہ بنایا تھا۔ حسرت صاحب ڈٹ کے میدان میں آ گئے عجب نہ تھا قلمی لڑائی طول کھینچتی سالک مرحوم نے درمیان داری کر کے معاملہ رفع دفع کرا دیا۔ شاعری کا یہ مجادلہ انہی دنوں چٹان میں یکجا شائع کر دیا گیا، لیکن جب میاں صاحب نے حسرت کو امروز سے نکالا تو چراغ حسن کف حسرت ملتے ہوتے چلے آئے۔ انہیں حسرت ہی رہی کہ میاں صاحب کو شاید اس ادبی معرکہ کا احساس ہو اور وہ جانے سے پہلے انہیں روک لیں کہ مولانا آپ کہاں جا رہے ہیں —— ؟

میاں صاحب جب کسی دوست سے آنکھیں پھیرتے تو ایشیائی شاعری کے روایتی معشوق کی طرح آن واحد میں بدل جاتے تھے۔ پھر انہیں نہ وصال کے لمحوں کا احساس ہوتا نہ عہد و پیماں کا پاس۔ بعض الفاظ اُن کے لغت میں تھے ہی نہیں۔ مثلاً ہجر کا لفظ وہ سمجھتے تھے کہ شاعروں کی ذہنی اُپج ہے۔ ہاتھ تنگ ہو تو اس کا نام ہجر ہے۔ روپیہ پاس ہو تو وصال کی خرید و فروخت مشکل نہیں

فیض احمد فیض راولپنڈی سازش کیس میں سزا کاٹ کر رہا ہوتے تو عام خیال تھا کہ پاکستان ٹائمز کے ایڈیٹر ہوں گے، لیکن ترکش سے تیر نکل چکا تھا۔ نوابزادہ مظہر علی ان کی غیر حاضری میں ایڈیٹر ہو گئے تھے اور اب وہ دستبردار ہونے کو

تیار نہ تھے۔ شرما حضوری میں فیض کو چیف ایڈیٹر بنا دیا گیا۔ لیکن بہمہ وجوہ وہ جلد ہی پروگریسو پیپرز لیمیٹیڈ سے الگ ہو گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ میاں صاحب نے جن نامور اہل قلم کی رفاقت سے اپنے اخباروں کا آغاز کیا تھا انہیں ایک ایک کر کے سبکدوش کر دیا۔ نوبت بہ اینجا رسید کہ ایک روز وہ خود ہی سبکدوش ہو گئے اس سبکدوشی نے ان کے اعصاب کی عمارت ہلا ڈالی۔ آخر کار اُن کا سفرِ زندگی پورا ہو گیا اور وہ سبھی طرح کی یادوں کا خزانہ چھوڑ کر داعی اجل کو لبیک کہہ گئے۔

انسان جب کسی معروف ہستی کے متعلق قلم اٹھاتا ہے تو اس کے دونو پہلو اُبھر اُبھر کے سامنے آتے ہیں۔

فی الجملہ میاں صاحب پنجاب کے اُن بڑے بڑے خاندانوں کی پشتینی وفاداری کا کفارہ تھے جنہیں سامنتی نظام نے پروان چڑھایا اور جن کے ہاتھ میں کروڑوں انسانوں کے معاش کی شہ رگ رہی ہے۔

رہے نام اللہ کا

دو کتابیں ـــ آغا شورش کاشمیری کے ایام اسیری کی یادگار،

حسین شہید سہروردی،

(ایک تجزیہ، ایک تصویر)

ایک راہنما شخصیت کا مکمل تجزیہ • ایک عظیم سیاست دان کے پُر رونق خط و خال، • ایک عظیم انسان اپنے تصورات کے آئینہ میں ـــ جس نے پاکستان کی تصویر میں رنگ بھرا۔ لیکن جس سے پاکستان نے بہت کم فائدہ اٹھایا، جس کے پہلو میں ایک خوبصورت دل تھا • جس کا دماغ مستقبل کے خلاؤں کو گھورتا رہا • جس نے مغربی پاکستان سے زخم کھائے، لبنان میں اللہ کو پیارا ہو گیا۔ اور اب مشرقی پاکستان کے آغوش میں ہمیشہ کی نیند سو رہا ہے۔

حمید نظامی،

(مطالعہ ، تجزیہ ، مشاہدہ)

پاکستان کا آخری نڈر صحافی • جس نے اردو صحافت کا بول بالا کیا، ملک کا ایک طویل دور جس کا خوشہ چین رہا • جس کے دروازے پر وزیر چوکیداروں کی طرح بیٹھتے تھے • جس سے حکومتی ایوانوں میں خوف محسوس ہوتا تھا • جس کو پاکستان نے جنم دیا اور جو پاکستان پر قربان ہو گیا، شورش کاشمیری کے قلم سے الفاظ کی بولتی چالتی تصویر۔



جب سیاست کا صِلہ آہنی زنجیریں تھیں ـــــ

پسِ دیوارِ زنداں

شورش کاشمیری نے اپنی دس سالہ قید کے مشاہدات و محسوسات کو اپنے لہُو سے لکھا ہے ـــ ادیب کا قلم، شاعر کی زبان، خطیب کا لہجہ، قیدی کی سرگزشت، جذبات کا طلوع و غروب ـ خیالات کا اتار چڑھاؤ ـــ ساتھیوں کے چہرے، راہنماؤں کے خاکے۔

ایک کہانی نہیں، کئی کہانیاں؟

تمغۂ خدمت

تین ماہ سترہ دن کے ایّام اسیری کی رُوداد۔ ایک قیدی کی نفسیات کا اظہار، ایک کہانی میں کئی کہانیاں، ایک داستان میں کئی عنوان ـــــ سیاسیات سے لے کر شخصیات تک کی تصویر ـ منٹگمری جیل یا انسانی مذبح خانہ، قیدیوں پر کیا گزرتی ہے؟

شورش کاشمیری کے قلم سے افسانہ سراؤں کی شعبدہ بازی سے زیادہ سچا افسانہ، آنکھوں دیکھا حال، نفس کے واردات، قلب کے تاثرات دماغ کے تصورات، مختلف لمحوں کے محسوسات، قرون مظلمہ کی تصویریں۔

میاں افتخار الدینؒ

شورش کاشمیری کے قلم سے



شورش کاشمیریؒ

ایک تجزیاتی خاکہ ہے

میاں صاحب کے بارے میں یہ پہلی کتاب ہے کتاب کیا؟ —— کتابچہ
جو روایت یا حکایت لکھی گئی ہے اس کا ایک ایک لفظ دماغ و دل کی ترازو میں تُل کے نکلا ہے
میاں صاحب کے متعلق بہرحال یہ حرفِ آخر نہیں، ہر شخص کے مطالعہ و تجربہ میں بوقلمونی ہوتی ہے۔
شورش کاشمیری نے میاں صاحب کو جس طرح دیکھا اور ان کے سیاسی چہرے کی رنگارنگی سے جو محسوس
کیا ان اوراق میں قلم برداشتہ لکھ دیا ہے — اِس تصویر کے بنانے اور سنوارنے میں صرف ذاتی
مطالعہ اور ذاتی مشاہدے ہی کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ یہ کوئی باقاعدہ سوانح عمری نہیں۔ میاں صا
فکار و آثار کو واقعتاً تذکرہ نگار کے قلم کا انتظار ہے اور یہ فرض ان کے بعض سات
انجام دے سکتے ہیں۔ جو کچھ اس کتابچہ میں ہے وہ محض نشانِ راہ ہے۔

مطبوعاتِ چٹان، ۸۰ میکلوڈ روڈ۔ لاہور

مطبوعہ چٹان پریس لاہور